

علامہ اقبال اور ہم

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن
لاہور

علامہ اقبال اور ہم

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن
لاہور

علامہ اقبال اور ہم

ڈاکٹر اسرار احمد
پروفیسر یوسف سلیم چشتی
سینئر نیا زی

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ○ فون : 3-5869501

نام کتاب _____ علامہ اقبال اور ہم

طبع اول تا طبع چہارم (اپریل ۷۷ء تا جنوری ۸۵ء) _____ ۱۶,۰۰۰

نظر ثانی و اضافہ شدہ ایڈیشن :

طبع پنجم (جولائی ۱۹۹۵ء) _____ ۲,۲۰۰

طبع ششم (اپریل ۱۹۹۷ء) _____ ۱,۱۰۰

ناشر _____ ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت _____ ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰

فون : ۵۸۶۹۵۰۱-۳

مطبع _____ شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت (اشاعت خاص : سفید کاغذ، مجلد) _____ ۷۲ روپے

(اشاعت عام : نوز پیم ایڈیشن) _____ ۳۰ روپے

مشمولات

• علامہ اقبال اور ہم (ص ۷)

• فکرِ اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ کا جائزہ
اور ہماری ذمہ داریاں (ص ۳۱)

ڈاکٹر اسرار احمد



• حیات و سیرتِ اقبال (ص ۶۶)

• فلسفہٴ اقبال (ص ۷۷)

اور

• ملتِ اسلامیہ کے نامِ علامہ اقبال کا پیغام (ص ۸۹)

پروفیسر یوسف سلیم چشتی



• اقبال اور قرآن (ص ۱۱۱)

ستیزندہ نیاززی

پیش لفظ

آج سے لگ بھگ ۲۱ سال قبل ۱۳ مئی ۷۷ء کو اپنی سن کالج لاہور میں علامہ اقبال مرحوم کی یاد میں ایک جلسہ منعقد ہوا تھا جس کے مرکزی مقرر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب تھے۔ یہ ایک یادگار خطاب تھا جس میں محترم ڈاکٹر صاحب نے نہایت مفردانہ انداز میں مسلمانان پاکستان اور علامہ اقبال کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر صاحب نے واضح کیا کہ اقبال بلاشبہ مصوروں و مجوز پاکستان تو تھے ہی، وہ قافلہ ملی کے ایک عظیم حدی خواں اور ایک بلند پایہ ”ترجمان القرآن“ بھی تھے۔ اس اعتبار سے پاکستان میں بسنے والا ہر مسلمان نہ صرف یہ کہ علامہ اقبال کے ساتھ ایک عظیم گونہ رشتے میں منسلک ہے بلکہ وہ تین جہات سے اقبال کے زیر بار احسان بھی ہے اس فکر انگیز خطاب کو بعد میں مرتب کر کے ”علامہ اقبال اور ہم“ کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔

علامہ مرحوم کے ساتھ محترم ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی کا اہم ترین سبب علامہ کا فکر قرآنی ہے۔ انہوں نے افکار قرآنی کو اپنے اشعار میں جس طرح سمو یا وہ انہی کا حصہ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ علامہ نے اپنی شاعری کے ذریعے قوم کو ایک پیغام دیا اور جید ملی میں ایک نئی روح پھونکی، لیکن اس بات سے شاید بہت کم لوگ واقف ہوں کہ اقبال درحقیقت ترجمان قرآن تھے ان کا پیغام بھی تمام تر افکار قرآنی ہی سے عبارت ہے۔ چنانچہ یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اپنے پر تاثیر کلام کے ذریعے مسلمانان برصغیر کو قرآن حکیم اور اس کی تعلیمات کی جانب متوجہ کرنا، انہیں قرآن کے انقلابی فکر سے روشناس کرانا اور اس طرح اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار کرنا فی الاصل اقبال کے پیش نظر تھا۔ اسی حقیقت کا نہایت شدت کے ساتھ انکشاف محترم ڈاکٹر صاحب پر بھی ہوا کہ کرنے کا اصل کام یہی ہے۔ چنانچہ وہ اس معاملے میں علامہ مرحوم کو بجاطور پر اپنا پیش رو قرار دیتے ہیں اور ان کی عظمت کے واضح الفاظ میں انہما و اعتراف میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔

محترم ڈاکٹر صاحب کے نزدیک دورِ حاضر میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید میں سب سے بڑا حصہ علامہ اقبال کا ہے۔ مسلمان بحیثیت مجموعی اس اہم حقیقت کو فراموش کر چکے تھے کہ اسلام محض ایک مذہب نہیں، دین ہے جو پورے نظامِ اجتماعی پر اپنا غلبہ و اقتدار چاہتا ہے۔ اقوامِ مغرب کی غلامی نے انہیں اس درجے پرست ہمت اور کوتاہ فکر بنا دیا تھا کہ وہ اپنے ذاتی نماز روزے پر ہی قانع ہو کر رہ گئے تھے اور اسی کو کل اسلام سمجھ بیٹھے تھے۔ ”تکبیر رب“ جیسے ولولہ انگیز انقلابی تصور کو

مسلمان نے تسبیح و وظائف تک محدود کر دیا تھا۔ اقبال نے بڑے زوردار انداز میں دین و مذہب کے اس محدود تصور پر ضرب لگائی اور نہایت دلنشین پیرائے میں دین کے اصل تصور کو اجاگر کیا:

یا وسعتِ افلاک میں تجسیمِ مسلسل یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدا مست یہ مذہب مملّا و عبادات و نباتات

فکرِ اقبال کے ان گوشوں سے محترم ڈاکٹر صاحب کو خصوصی دلچسپی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی انہیں کسی فورم سے اقبال کے موضوع پر اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی انہوں نے خوش دلی کے ساتھ اس دعوت کو قبول کیا۔ مرکز یہ مجلس اقبال لاہور کے زیرِ اہتمام یومِ اقبال کی تقریب میں متعدد بار وہ مسمان مقرر کی حیثیت سے خطاب کر چکے ہیں۔۔۔ اس ضمن میں ۲۱/اپریل ۸۶ء کو المہراہل میں یومِ اقبال کی تقریب میں ”فکرِ اقبال کی روشنی میں“ حالاتِ حاضرہ اور ہماری قومی ذمہ داریاں“ کے عنوان سے انہوں نے ایک مبسوط مقالہ تحریری شکل میں پیش کیا تھا جو بعد میں ”میشاق“ میں بھی شائع ہوا۔ اس فکر انگیز مقالے کو بھی زیرِ نظر کتاب کے اس تازہ ایڈیشن میں شامل کر لیا گیا ہے۔

بات نامکمل رہے گی اگر ”فکرِ اسلامی کی تجدید اور علامہ اقبال“ اور ”فکرِ اقبال کی تعمیل کا تاریخی جائزہ“ کے عنوان سے محترم ڈاکٹر صاحب کی ان دو تحریروں کا ذکر نہ کیا جائے جو اب ان کی کتاب ”برِ عظیمِ پاک و ہند میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل“ کی مستقل جزو ہیں۔ بحیثیتِ مجددِ فکرِ اسلامی اقبال کا کردار ان تحریروں کے ذریعے زیادہ وضاحت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ یہ تحریروں اور اخباری کالموں کی صورت میں ۹۲ء کے نصفِ آخر میں روزنامہ ”نوائے وقت“ میں شائع ہوئیں اور پھر مذکورہ بالا کتاب کا حصہ بن گئیں۔ علامہ اقبال کے بارے میں محترم ڈاکٹر صاحب کے خیالات کو پورے طور پر جاننے کے لئے ضروری ہو گا کہ زیرِ نظر کتاب کے ساتھ ساتھ ان تحریروں کو بھی نظر سے گزار لیا جائے۔ ان مقالات و مضامین کے مابین جن کا اوپر ذکر کیا گیا، اگرچہ اچھا خاصا زمانی فصل اور بعدِ موجود ہے کہ پہلا مضمون ”علامہ اقبال اور ہم“ ۴۳ء کا مرتب کردہ ہے، دوسرا مقالہ ”فکرِ اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ کا جائزہ“ اس کے ۱۲ سال بعد ۸۶ء کا تحریر کردہ ہے اور ان حالیہ تحریروں کی تسوید جن کا اوپر حوالہ دیا گیا، مزید ۶ سال بعد یعنی ۹۲ء کے اوائل میں ہوئی، لیکن آپ دیکھیں گے کہ ان تمام مضامین و مقالات میں فکری اعتبار سے کوئی تناقص و تباہی نہیں ہے، بلکہ ایک واضح فکری تسلسل موجود ہے جو بلاشبہ ایک نہایت قابلِ قدر بات ہے!

علاوہ ازیں زیرِ نظر کتاب میں شارحِ کلامِ اقبال پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کے بعض نہایت وقیع مضامین بھی شامل کئے گئے ہیں کہ جن کے ذریعے اقبال کی شخصیت، ان کا فلسفہ و خودی

اور ملت اسلامیہ کے نام اقبال کے پیغام کا ایک جائزہ نہایت جامعیت اور عمدگی کے ساتھ قاری کے سامنے آتا ہے۔ ان مضامین سے متعلق خاص بات یہ ہے کہ یہ ۱۹۳۳ء میں اس وقت سپرد قلم کئے گئے جب علامہ اقبال مرحوم ابھی بقیہ حیات تھے۔ چشتی صاحب مرحوم ان خوش نصیب لوگوں میں سے تھے جنہیں ایک طویل عرصے تک علامہ مرحوم کی خدمت میں حاضری کا مسلسل موقع ملتا رہا۔ لہذا اقبال اور افکار اقبال کے بارے میں چشتی صاحب مرحوم کے مضامین غیر معمولی اہمیت و وقعت کے حامل ہیں۔ یہ مضامین ”میشاق“ کی پرانی فائلوں میں دبے ہوئے تھے، زیر نظر کتاب میں انہیں اس خیال سے شامل کیا جا رہا ہے کہ یہ قیمتی علمی مضامین ضائع ہونے سے بچ جائیں اور لوگوں کے لئے ان سے استفادہ کرنا منسوت ممکن ہو سکے۔ علامہ سے قرب رکھنے والے ان کے ایک اور ارادت مند جناب سید نذیر نیازی مرحوم کا واقع مضمون ”اقبال اور قرآن“ بھی اسی غرض سے شامل کتاب کیا گیا ہے۔ اس طرح کتاب کا یہ تازہ ایڈیشن اپنے حجم کے لحاظ سے پہلے کے مقابلے میں کم و بیش تین گنا ضخامت کا حامل ہے۔

یادش بخیر چند سال قبل ایران کے مشہور مفکر و دانشور ڈاکٹر علی شریعتی مرحوم کی اقبال کے موضوع پر ایک کتاب نظر سے گزری۔ ڈاکٹر شریعتی کے بارے میں یہ بات اکثر احباب کے علم میں ہوگی کہ ایران کے حالیہ انقلاب کے لئے فکری و نظری غذا انہوں نے ہی فراہم کی تھی۔ ان کے انقلابی افکار جو مختصر کتابچوں کی صورت میں نہایت سرعت کے ساتھ ایران کے طول و عرض میں پھیلے، انقلاب ایران کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی اقبال کے فارسی کلام اور فلسفہ و فکر سے شدید طور پر متاثر تھے اور خود انہوں نے بہت کچھ فکری غذا اقبال سے حاصل کی تھی۔ حسن اتفاق سے اقبال اور اس کے افکار پر انہوں نے جو کتاب مرتب کی اس کا نام بھی بعینہ وہی رکھا جو محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب کے لئے ۱۹۷۷ء میں تجویز کیا تھا، یعنی ”ما و اقبال“۔ جس کا سید حسان ترجمہ بھی بنتا ہے : ہم اور علامہ اقبال O O

تاظم نشر و اشاعت

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۱۳ جولائی ۱۹۹۵ء

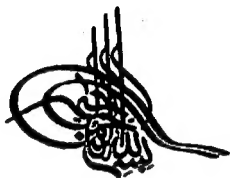
علامہ اقبال مرحوم

اور

مہم

اسرار احمد

ایک تقریر جو ۳ مئی ۱۹۷۴ء کو ایچی سن کالج لاہور
میں ایک اجتماع منعقدہ بیاد علامہ اقبال مرحوم میں
زیر صدارت پروفیسر اشفاق علی خاں کی گئی



خطبہ مسنونہ اور دُعا کے بعد:

صدر گرامی قدر، مہمان گرامی، محترم پرنسپل صاحب، اساتذہ کرام اور عزیز طلبہ! اگرچہ پاکستان کی اس شہور درس گاہ میں اس سے قبل متعدد بار خطاب کا موقع مل چکا ہے تاہم مجھے شدید احساس ہے کہ آج کے اس اجلاس سے جو یاد علامہ اقبال مرحوم منعقد ہو رہا ہے میرا خطاب کرنا ایک غیر معمولی جرات ہی نہیں کسی قدر نامناسب جسارت بھی ہے۔

اس کا سبب بالکل واضح ہے یعنی یہ کہ میں نہ زبان وادب کے میدان کا آدمی ہوں نہ فکرو فلسفے کا، بلکہ میری بنیادی تعلیم سائنس کی ہے اور ثانوی تربیت طب و علاج کی۔ جبکہ علامہ اقبال کی دوسب سے زیادہ معروف حیثیتیں یہی ہیں کہ وہ ایک بہت بڑے شاعر بھی ہیں اور ایک عظیم فلسفی اور مفکر بھی۔ لہذا علامہ مرحوم کے بارے میں میری تقریر کچھ اٹل بے جوڑ سی بات ہے۔ بایں ہمہ جب مجھے اس تقریب میں حاضر ہو کر اظہار خیال کی دعوت دی گئی تو میں نے بغیر کسی پس و پیش یا رد و قدح کے فوراً آمادگی ظاہر کر دی۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ میرے نزدیک پاکستان میں بننے والا ہر مسلمان قطع نظر اس سے کہ وہ عوام میں سے ہو یا خواہ میں سے اور بالکل اُن ٹرچہ و جاہل ہو یا عالم و فاضل، علامہ مرحوم کے ساتھ ساتھ گانہ و سہ گونہ شہوتوں میں منسلک ہے: ایک یہ کہ یہ مملکت خدا داد سرزمین پاکستان جس میں ہم ایک آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے اقامت گزریں ہیں، اس کا وجود و قیام علامہ مرحوم ہی کے تخیل و تصور کا رہن منت ہے۔

دو ٹکڑے یہ کہ وہ عالمی ملت اسلامی اور امت مرحومہ جس سے ہم سب منسلک ہیں اس دور میں اس کی عظمت و سطوت پارینہ کا سب سے بڑا اثر یہ خواں بھی اقبال ہے اور اس اِحیاء و نشاۃ ثانیہ کا سب سے بڑا قادی خواں بھی اقبال ہی ہے ————— تیسرے یہ کہ وہ دین حق جس کے ہم سب نام لیا ہیں اور جس کے بارے میں کچھ ہی پہلے عالی مرحوم نے کہا تھا:

وہ جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے!

پدیس میں وہ آج غریب الغرائب ہے!

اس دور میں خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اس کے اسرار و رموز کا سب سے بڑا راز دان بھی اقبال ہی ہے اور اس کی روح باطنی اور جہدِ ظاہری دونوں کے تجدید و احیاء کے عظیم ترین نقیب کی حیثیت بھی اقبال ہی کو حاصل ہے!

یہ سرگازہ تعلق تو علامہ مرحوم کے ساتھ ہر پاکستانی مسلمان کو حاصل ہے۔ مجھے ذاتی طور پر ایک چوتھی خصوصی نسبت رجبِ اقبال سے یہ ہے کہ ادھر کچھ عرصے سے یہ حقیقت مجھ پر شدت کے ساتھ منکشف ہو چکی ہے کہ احیائے اسلام کی شرط لازم تجدیدِ ایمان ہے اور ایمان کا اصل منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ گویا ملتِ اسلامی کی نشاۃ ثانیہ اور تشکیلِ جدید کی کوشش ہو یا احیائے اسلام اور غلبہٴ دین حق کی جہدِ جہدِ دونوں کا اصل مٹی و مدار اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں کا قرآن حکیم کے ساتھ صحیح تعلق دوبارہ استوار کیا جائے اور اس حقیقی نسبت کی تجدید کی کوشش کی جائے جو ایک مسلمان اور قرآن کے مابین ہونی چاہیے اور میں دیکھتا ہوں کہ ملتِ اسلامی اور دین حق دونوں کے احیاء اور نشاۃ ثانیہ کے اس طرح قرآن حکیم کے ساتھ وابستہ ہونے کا احساس اسی قدر بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ شدت کے ساتھ علامہ مرحوم کو تھا۔ یَغْفِرُ اللَّهُ لَهُ وَبِحَمْدِهِ!!

خلاصہٴ کلام یہ کہ ————— میں نہ علامہ مرحوم کی شاعری اور ان کی فصاحت و بلاغت یا قدرتِ کلام کے بارے میں کسی ماہر فن ناقد کی حیثیت سے کچھ عرض کرنے کا مجاز ہوں ————— ان کے فکرو فلسفے پر خالص فلسفیانہ انداز میں کوئی تبصرہ کر سکتا ہوں ————— بلکہ میں نہ کہ وہ بالاچارہ ستوں ہی کے بارے میں کچھ مختصر عرض کروں گا:

(۱) مصورِ پاکستان

سب جانتے ہیں کہ علامہ مرحوم بنیادی طور پر سیاست دان نہ تھے بلکہ انتہائی گوشش کے باوجود بھی وہ اپنے مزاج کو عملی سیاست کے ساتھ سازگار نہ بنا سکے۔ اس کے باوجود انہوں نے برصغیر ہندوپاک کی مسلمان قوم کے مستقبل کے بارے میں جو کچھ سوچا اور ان کے مسائل کا جو حل پیش کیا وہ ان کی بیدار مغزی اور معاملہ فہمی بلکہ کہنا چاہیے کہ سیاسی تدبیر کا شاہکار ہے۔ سنہ ۱۹۴۷ء سے قبل تو سوال ہی کیا پیدا ہو سکتا ہے، اس کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک ہندوستان کی تقسیم کا خیال تک کسی کے ذہن میں نہیں آسکتا تھا۔ یہ صرف علامہ مرحوم ہی کی نگاہ دور رس و دور بین تھی جس نے حالات کے رخ اور زمانے کی رفتار کو پہچان کر مسلمانان ہند کے جملہ مسائل کا حل اسے قرار دیا کہ ہندوستان کے کم از کم شمال مغربی گوشے میں واقع مسلم اکثریت کے علاقوں پر نسل مسلمانوں کی ایک آزاد اور خود مختار مملکت قائم کی جائے!

س۔ آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی

دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

پاکستان کے ساتھ علامہ کا تعلق صرف ”مصور“ کا نہیں، اس سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ اگرچہ خود عملی سیاست کے مرد میدان نہ تھے، تاہم حالات کی صحیح نباضی اور ان کی سیاسی بصیرت کا دوسرا شاہکار یہ ہے کہ انہوں نے موجودہ وقت حالات میں مسلمانان ہند کے قومی مقدمے کی ڈپٹی کے لیے صحیح ترین وکیل ڈھونڈ لیا اور نہ صرف یہ کہ ان کی نگاہ دور رس نے مسلمانان ہند کی قیادت عظمیٰ کے لیے محمد علی جناح مرحوم کو تاناکا بلکہ خود ان میں اپنی اس حیثیت کا احساس اجاگر کیا۔ اور یہ تو بلاشبہ علامہ مرحوم کے غایت خلوص و اخلاص کا بے ثبوت اور ان کے حد درجہ انکسار اور تواضع کی دلیل قاطع ہے کہ انہوں نے اس قائد کے ساتھ اس کی تنظیم کے ایک صوبائی صدر کی حیثیت سے کام کرنا بھی منظور کر لیا حالانکہ ان کے مزاج کو اس قسم کے کاموں کے ساتھ کوئی طبعی مناسبت نہ تھی۔ اس طرح علامہ مرحوم نے نہ صرف یہ کہ پاکستان کا تصور پیش کیا بلکہ اس خاکے میں رنگ بھرنے کی عملی

جدوجہد کے ابتدائی مراحل میں بنفس نفیس شرکت بھی کی اور گویا متحرک پاکستان کے کارکنوں کی فہرست میں شامل ہو گئے۔

اس اعتبار سے علامہ مرحوم کا ایک عظیم احسان ہر اس مسلمان کی گردن پر ہے جو پاکستان کی فضا میں ایک آزاد شہری کی حیثیت سے سانس لے رہا ہے۔ افسوس کہ ہم نے بحیثیت قوم خود پاکستان ہی کی قدر نہ کی، علامہ کے احسان کو کیا یاد رکھتے۔ کاش کہ لوگوں کو معلوم ہوتا کہ آزادی اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے اور یہ مملکت خدا داد پاکستان اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے۔ اسی صورت میں ہمیں علامہ مرحوم کے ذاتی احسان کا بھی کوئی احساس ہو سکتا تھا۔

ہماری اسی ناقدری کا نتیجہ ہے کہ پاکستان کا ایک بازو نہ صرف یہ کہ کٹ کر علیحدہ ہو گیا بلکہ انوکھی فوری طور پر اس کی کامل قلب ماہیت بھی ہو گئی اور اس نے ایک اسلامی یا اس سے بھی کمتر درجے میں ایک مسلمان مملکت کے بجائے ایک لادینی، قومی، سوشلسٹ ریاست کا روپ دھار لیا۔ اس حادثہ فاجعہ پر بجا بات میں جس طرح خوشی منائی گئی اور اسے جس طرح ہزار سالہ شکست کے انتقام سے تعبیر کیا گیا اس سے ان لوگوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں جو ہندوؤں کے بارے میں کسی جن ظن میں مبتلا تھے۔ اگر سرسازدراگان دھمی اس نہرو خاندان کی بیٹی ہوتے ہوئے جس کی وسیع الشرب ضرب اٹل ہے، یہ الفاظ زبان سے نکال سکتی ہے تو قیاس کن زنگستان من بہار مرا کے مصداق سوچنے کی بات ہے کہ فرقہ پرست متعصب مزاج ہندو اکثریت کا رویہ اگر اسے ایک بار ہندوستان میں فیصلہ کن اقتدار حاصل ہو جاتا، تو کیا ہوتا!

حقیقت یہ ہے کہ اگر خدا خواستہ پاکستان قائم نہ ہوا ہوتا تو نہ صرف یہ کہ اب تک ہندوستان سے اسلام کا صفایا ہو چکا ہوتا بلکہ پورا مشرق وسطیٰ ہندو امپیرلائزم کے سیلاب کی زد میں ہوتا۔ علامہ مرحوم نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بارے میں فرمایا تھا:

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہباں

اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

تو اگرچہ شخصاً تو علامہ مرحوم کا کوئی مقابلہ یا موازنہ حضرت مجددؒ کے ساتھ خارج از بحث ہے، تاہم اگر یہ کہا جائے کہ خاص طور پر ہند میں سرمایہ ملت کی نگہبانی کے اعتبار سے علامہ مرحوم کو ایک

نسبتِ خصوصی حضرت مجدد کے ساتھ حاصل تھی یا یہ کہ علامہ مرحوم کی شخصیت کا یہ پہلو حضرت مجدد کے ساتھ ان کی والہانہ محبت اور عقیدت ہی کا مظہر ہے تو غالباً یہ غلط نہ ہوگا۔

(۲)

قافلہ ملی کا حدی خواں

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کے پیش نظر یہ بات بڑی ہی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانانِ ہند کے قومی مسائل کا ذکر علامہ مرحوم کے اشعار میں کہیں موجود نہیں ہے اور اپنے اشعار میں وہ عالمی ملتِ اسلامیہ کے نقیب اور قافلہ ملی کے حدی خواں نظر آتے ہیں۔

علامہ مرحوم کی شاعری کے دورِ اول میں، جیسا کہ سب کو معلوم ہے، نہ صرف یہ کہ ان کا جذبہ حب الوطنی چمکنا پڑتا ہے بلکہ باقاعدہ ہندی قوم پرستی کے آثار بھی ملتے ہیں لیکن 'بانگ درا' ہی کے نصفِ آخر میں دفعہً وہ عالمی ملتِ اسلامیہ کے ترجمان و حدی خواں کی حیثیت سے نمودار ہو جاتے ہیں اور "ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا" اور "میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے؛ کی جگہ "ہند عرب ہمارا ہندوستان ہمارا، سلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" کا وجد آفریں ترانہ ان کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے۔ ان دو انتہاؤں کے مابین ہندوستان کے مسلمانوں کے جدِ اگادہ قومی تشخص کا مسئلہ جو ان کے سیاسی فکر کا مرکز و محور ہے، ان کے اشعار میں کہیں نظر نہیں آتا۔

میرے نزدیک یہ تصورِ لپندی (IDEALISM) اور حقیقت بینی (REALISM)

کا حسین ترین امتزاج ہے جس سے ہیں علامہ مرحوم کی شخصیت نصف نظر آتی ہے۔ یوں کہہ لیں کہ یہ "أَصْلُهَا ثَابِتٌ" اور "فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ" کی عمدہ مثال ہے کہ ایک جانب ٹھکانہ خیال انتہائی بلند یوں کو چھو رہے ہوں اور دوسری طرف انسان کا تعلق اپنے نزدیک ماحول کے تلخ حقائق سے بھی منقطع نہ ہونے پاتے۔

۱۔ سورۃ الباقیم کی ایک تفسیر سے اخذ: ترجمہ: اس کی بڑھی ہوئی ہے اللہ شاہین آسمان سے آئیں کر رہی ہیں!

علامہ مرحوم کی قلمی شاعری میں، جیسا کہ ابتداء میں عرض کیا گیا تھا، دونوں رنگ موجود ہیں، مرثیہ خوانی کا بھی اور مدحی خوانی کا بھی۔ پہلے اعتبار سے یوں سمجھیے کہ انہوں نے شبلی و حالی دونوں کی بنیادی کافرض ادا کیا اور ملت اسلامیہ کے شاندار اور تابناک ماضی کی یاد سے بھی دلوں کو گداز کیا اور امت مرحومہ کی موجودہ زبوں حالی کا نقشہ بھی نہایت موثر اور دلہذاں انداز میں کھینچا۔ مثال کے طور پر حالی کے یہ اشعارلاحظ فرمائیے:

اے خاصہ خاصانِ رمل وقتِ دعا ہے امتِ پتری آکے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے پرہیز میں وہ آج غریب الغرا ہے

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھیے اسلام کا گر نہ ابھرتا دیکھیے
ماننے نہ کہی کہ مذہب ہر عزیز کے بعد دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھیے
اور پھر پڑھیے وہ نظم جو ”مصلیٰ“ (جزیرہ سسلی) پر علامہ مرحوم نے کہی اور اندازہ کیجئے اقبال کی قلمی مرثیہ خوانی کا!
لے ابل کھول کر اے دیدہ و نوا بار! وہ نظر آتا ہے تہذیبِ مجازی کا مزار!
تھاپہاں ہنگامہ ان صحرائیںوں کا کبھی بحر بازی گاہ تھاجن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن شہنشاہوں کے درباروں میں تھے بجلیوں کے شیانے جن کی تلاوٹوں میں تھے
اک جہانِ تازہ کا پیغام تھاجن کا ظہور کھا گئی عھر کہن کو جن کی تیغِ ناصبور
مردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قہم سے ہوا آدمی آزاد زنجیرِ توہم سے ہوا
غفلوں سے جس کے لذت گیر اب ہم گوش ہے
کیا وہ بحیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے؟

یا پڑھیے ”بانگ درا“ میں اس کے قریب ہی کی وہ نظم جو ”بلادِ اسلامیہ“ کی یاد میں کہی گئی۔ اور جس میں دلی، بغداد، قرطبہ اور قسطنطنیہ ایسے عروسِ ہائے بلاد میں سے ایک ایک کا نام لے لے کر انتہائی رقتِ انجیز پر لائے میں امتِ مسلمہ کی عظمتِ گزشتہ و سطوتِ پارینہ کا مرثیہ پڑھا گیا۔
یا پڑھیے علامہ اقبال کی وہ طویل نظم جو ”مسجدِ قرطبہ“ کے عنوان سے ”بالی جبریل“ میں شامل ہے۔ اس میں فکر و خیال کی عام بلند پروازی کے علاوہ جذبہ ملی کی جو بے قراری از ابتدا تا انتہا جاری و ساری

ہے اس سے بھی قطع نظر صرف وہ اشعار پڑھیے جو براہ راست مسجدِ قرطبہ سے مخاطب ہو کر کہے گئے ہیں اور اندازہ کیجئے جذباتِ ملی کے اس طوفانِ کجواں کا فرہندی کے قلب میں موجزن تھا!! اور غور کیجئے اس کے دو آخری بندوں پر کہ کس خوبصورتی کے ساتھ استب مرحومہ کی تجدید و احیاء کا پیغام دیا گیا اور کیسے جذبہ پرور انداز میں قلبِ اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کی دعوت دی گئی۔

اور یہی دراصل علامہ مرحوم کی ملی شاعری کا وہ مثبت اور تعمیری پہلو ہے جو انہیں ملت کے سابق مرثیہ خوانوں سے ممتاز اور فزیز کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ علامہ کے یہاں صرف دردِ انجیز نالے ہی نہیں ہیں انتہائی دلولہ انجیز پیغام عمل بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک شاندار مستقبل کی خوشخبری بھی ہے جس نے یاس اور قنوطیت کی ظلمت کا پردہ چاک کر دیا اور دلوں میں امید کے چراغ روشن کر دیئے۔ یوں تو علامہ کے اشعار میں یہ امید افزا پیغام گویا رجا بابا ہوا ہے، چنانچہ بانگِ درا کے متوسط حصے میں بھی جا بجا یہ رنگ موجود ہے کہ :

محل کے صحرا سے جس نے روم کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
ناب ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

اور

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا

ہوتا ہے جادہ پیا پھر کارواں ہمارا

لیکن خاص طور پر طلوعِ اسلام تو گویا از ازل تا آخر ایک مطلق حیل ہے :-

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیاں کا اثر پیدا فلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ نسیم ٹوٹا تو کیا غم ہے کہ خونِ مدبرِ انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!

لوا پیرا ہوا ہے بلبل کہ ہوتیرے ترنم سے

کبوتر کے ترن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا!

سبق پھر ٹپھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اور

علامہ مرحوم کی یہ ملی شاعری جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، حدودِ ارضی سے بالکل آزاد ہے اور ان کے اشعار کو پڑھتے ہوئے کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ ان کا قائل کبھی ایک محد و خطہ ارضی میں بنے والے مسلمانوں کے خصوصی مسائل کے بارے میں بھی غور کرتا ہوگا۔ گویا ان کی شاعری وَلَکِنَّهُ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ کے ہر شاہیے سے بالکل پاک ہے۔ اندازہ کیجئے کہ ایک ہندی مسلمان ارضِ لاہور میں بیٹھا کہہ رہا ہے کہ:-

طہران ہو گر عالم مشرق کا جنتیہ شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے
لیکن دوسری طرف اپنے گرد و پیش سے بھی بے خبر نہیں ہے بلکہ حالات کی نبض پر ہاتھ دھرے مسلمان ہند کے مسائل کی تشخیص بھی کر رہا ہے اور ان کا حل بھی پیش کر رہا ہے!

ملتِ اسلامیہ کی تجدید اور امتِ مرحوم کی نشاۃ ثانیہ کی جو فوری امید علامہ کو تھی، محسوس ہوتا ہے کہ عمر کے آخری دور میں اسے بہت سے صدموں سے دوچار ہونا پڑا اور شاید یہ کبنا غلط نہ ہوگا کہ بعد میں ایک قسم کی ناامیدی اور یاس کی سی کیفیت بھی علامہ مرحوم بپٹاری ہو گئی تھی، جو مثلاً اس قسم کے اشعار سے ظاہر ہے کہ:

ۛ نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ رُوحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!

اور

ۛ سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۱۷ کا ایک ٹکڑا ترجمہ، لیکن وہ تو زمین کی جانب ہی جھکتا چلا گیا!
ۛ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت طہران کی بجائے ارضِ لاہور کو عطا فرمادی جہاں قُبّۃِ اسلامیہ کا یہ عُدی خواں مدفون ہے۔ ابھی جو عالمی اسلامی سربراہی کا نفرین لاہور میں منعقد ہوئی تھی اس کے موقع پر جناب قار انبالوی نے علامہ مرحوم کی روح سے خطاب کر کے کیا خوب کہا ہے

اسے دیدہ بیدار خودی! مرد قلند! رحمت ہے خدا کی ترے افکار میں پر
لاہور بنا ہے تری ہمت کا جنتیہوا کیا رنگِ بہاراں ہے گلستانِ یقین پر
تعبیر سے ہم دوش ہے اقبال تو خواب سرور ہو تو خلد میں جعینتِ دین پر

تیرے عجیب میں کہیں گویا زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف!

لیکن اس کا اہل سبب یہ ہے کہ علامہ مرحوم نابغہ (GENIUS) اشخاص میں سے تھے جن کے بارے میں یہ قلم ہے کہ وہ وقت سے پہلے پیدا ہوتے ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ اپنے زمانے سے قدرے بعد کی باتیں کرتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقویم میں تیس چالیس سال کا عرصہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ علامہ مرحوم نے جس دودھ کا خواب دیکھا تھا اس کی ابتدا ہو رہی ہے۔

لے اپ۔ ن۔ نومبر ۱۹۴۳ء) یہ بات راقم نے ۲۴ مئی ۱۹۴۳ء کو کہی تھی اور بعد اللہ ایک سال سے کم مدت کے اندر اس کی دو عظیم شہادتیں بھی رونما ہو گئی تھیں۔ چنانچہ ایک طرف اکتوبر ۱۹۴۳ء کی عرب اسرائیل جنگ میں ایک بالکل نیا نقشہ دنیا کی نگاہوں کے سامنے آ گیا تھا۔ چنانچہ وہی عرب جو بزدل اور بھگورنے مشہور ہو گئے تھے، ان کی بہادری، جرات اور جانا بازی کے چرچے علم ہو گئے اور وہ عالم عرب جس کا اختلاف و افتراق ضرب اشل بن چکا تھا دفعۃً ایک متحد قوت کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آ کر کھڑا ہوا۔ یہاں تک کہ یہ بخشک فرود تیل کا ہتھیار استعمال کر کے امریکہ ایسے شاہین سے لڑ گیا! دو مٹری طرف فروری ۱۹۴۴ء کی عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس منعقدہ لاہور نے عالم اسلام کے اتحاد کا ایک نہایت دلنظر منظر چشم عالم کے سامنے پیش کر دیا جس کی اہمیت کا اہل اندازہ اس سرکاری سے لگایا جاسکتا ہے جو اس وقت بھارت اور اس کے گھر پر دواؤں پرطاری ہو گئی تھی۔

یہ دوسری بات ہے کہ علامہ اقبال ہی کے ان اشعار کے مصداق کہ ”دنیا کو ہے پھر مرکز روح و بدن بچ۔ تہذیب نے پھر اپنے دھندوں کو اجاڑا! اور اللہ کو پامردی مومن پر مہر و سہیلیں کو یورپ کی کشینوں کا سہارا!“ دنیا کی ایسی قوتوں نے احیاء دین و ملت کی اس چڑھتی لہر کو نہ صرف روک دیا بلکہ سپانی پر مجبور کر دیا۔ تاہم اس کے بعد سے اب تک یہ لہر اتار اور چڑھاؤ کے کسی ادارے سے گزر کر بہر حال اس حد تک آگے بڑھ آئی ہے کہ پوری مغربی دنیا ”سلم فیتہ“ ملتزم“ سے مخالفت نظر آتی ہے۔ اور اگرچہ ایسی احیاء دین و ملت کا یہ عمل مستقبل قریب میں بعض بڑے بڑے صدقات سے دوچار نظر آتا ہے تاہم بالآخر جو لہر جائزہ اقبال نے دی تھی وہ الفاظ قرآنی ”لست کبک طبعاً عن حلیق“ اور احادیث نبویہ میں وارد شدہ پیشگوئیوں کے مطابق لازماً پوری ہو کر رہے گی۔ اور یہ بتا رہی ہے یہ قلمت شب کہ صبح نزدیک آرہی ہے! اُسے مصداقِ حوادث و واقعات عالم کی تیر رفتار بتا رہی ہے کہ بالآخر لوہے کے قازحی پر خلافتِ علیؑ منہاجِ البروت کے نظام کا قیام اب بہت زیادہ دور نہیں ہے!

(اسرار احمد ۸ نومبر ۱۹۴۳ء)

رُومی ثنائی

جہاں تک دینِ حق کے اسرار و رموز اور حقائق و معارفِ ایمانی اور علم و حکمتِ قرآنی کی ترجمانی کا تعلق ہے، حقیقت یہ ہے کہ علامہ مرحوم رومی ثنائی تھے! انہوں نے علی الاعلان مولانا روم کو اپنا شیخ تسلیم کیا ہے اور پیرِ رومی کے ساتھ بحیثیتِ تلمیذِ ہندی ان کے مکالمات ان کے کلام کی زینت ہیں بلکہ ایک مقام پر انہوں نے اپنی اس نسبت کا ذکر قدرے فخریہ انداز میں بھی کیا ہے یعنی ع

بہمن زلوة رمز آشنائے روم و تبریز است! *

(۱) اب اگر مثنوی مولانا روم کے بارے میں عارفِ جاتی کے یہ اشعارِ مجنی حقیقت ہیں کہ:

(۲) مثنوی مولوی معنوی بست قرآن در زبان پہلوی

(۳) من چہ گویم و صفت آں عالیجناب نیست پیغمبر و لے دارد کتاب

تو یعنی علامہ اقبال مرحوم بھی دورِ حاضر کے ترجمان القرآن قرار دینے والے کے مستحق ہیں۔

علامہ مرحوم خود بھی اس کے مدعی ہیں کہ ان کے اشعار و فکر و پیغامِ قرآنی ہی کی ترجمانی پر مشتمل ہیں اور اس پر انہیں اس درجہ وثوق اور اعتماد ہے کہ انہوں نے مثنوی اسرار و رموز کے آخر میں ”عرضِ حالِ مصنف بحضورِ رحمۃ اللعالمین“ کے ذیل میں یہاں تک لکھ دیا کہ:

(۴) گردلم آتینے زبے جوہر است در بحرِ فرغِ غیرت آں مضمر است

(۵) پردۂ ناموسِ محرم چاک کن ایں خیاباں را ز خارِ مپاک کن

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا!

(۶) بے نصیب از بوسہ پا کن مرا!

آخری مصرع کو پڑھ کر ہر وہ شخص کانپ اٹھتا ہے جسے کسی بھی درجے میں علامہ کی نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا اندازہ ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ خود میں نے جب بھی

یہ اشعار پڑھے ایک مرتبہ ضرور جھرجھری سی آگئی اور دل لرز اٹھا کہ اللہ اکبر! اپنے حق میں اتنی بڑی

بددعا! لیکن پھر اس خیال سے تسکین ہوتی رہی کہ دراصل اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم کس

درجہ نچرے یقین تھا اس بات پر کہ انہوں نے اپنے کلام میں قرآن ہی کی ترجمانی کی ہے۔

— رُوح دین کی تشریح و تعبیر | جہاں تک روح دین کی تشریح و تعبیر کا تعلق ہے علامہ مرحوم کی خدمات کو منفی مثبت دونوں

میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ایک طرف انہوں نے بنیادی اعتقادات اور اساسی فکر کے ضمن میں ہمہ اوستی نظریات اور شیخ ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود کی مامیاد تعبیرات کی پرزور تردید کی اور جواباً وہ نظریہ پیش کیا جو اقبال کے فلسفہ خودی کے نام سے موسوم ہے اور اصلاً حضرت مجددؑ کے نظریہ وحدت الشہود سے مشابہ ہے۔ اور دوسری طرف عبادات کے میلان میں زری رسم پرستی (RITUALISM) کی زور داری کی اور اثباتاً عبادت کی اہل رُوح یعنی عشق و محبت خداوندی پر زور دیا۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ جہاں تک ہمہ اوست کی مختلف تعبیروں کے مابین فرق یا ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود کی باریکیوں کا تعلق ہے ان کی وضاحت کا یہ مناسب موقع ہے

یہاں راقم یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ چند سال قبل جب مولانا امین احسن اسلامی مدظلہ آنکھ کے آپریشن کے لیے لاہور میں مقیم تھے امداد پبلشنگ میں کسی وجہ سے تاخیر ہو رہی تھی تو فرصت کے اس وقت کا مصروف مولانا نے یہ نکال کر علامہ اقبال کا پورا اردو اور فارسی کلام از ابتدا تا انتہا نظر سے گزار لیا۔ لاہور کے تمام زلفاء و اصحاب جانتے ہیں کہ اس کے نتیجے کے طور پر طویل عرصے تک ایک خاص کیفیت مولانا پر طاری رہی اور سب عادت مولانا نے اپنے تاثر کا اظہار بھی بر ملا اور ناشکاف الفاظ میں فرمایا۔ اس سلسلے میں مولانا کے تاثر کی شدت کا اندازہ ان کے مسند درجہ ذیل دو جہلوں سے لگایا جاسکتا ہے جو راقم الحروف کے حافظے میں محفوظ رہ گئے ہیں:

ایک یہ کہ قرآن حکیم کے بعض مقامات کے بارے میں مجھے کچھ مان سنا تھا کہ میں نے ان کی تعبیر جس اسلوب کی ہٹے یا کوئی اور نہ کر سکے لیکن علامہ اقبال کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ وہ ان کی تعبیر مجھ سے بہت پہلے اور مجھ سے بہت بہتر کر چکے ہیں! اور دوسرے یہ کہ اقبال کا کلام پڑھنے کے بعد میرا دل پیٹھ سا گیا ہے کہ اگر ایسا صدی خوال اس انت میں پیدا ہوا لیکن یہ امت شمس سے نہ ہوتی تو جہانم کے کرنے سے کیا ہوگا؟ (امیر احمد)

نہ ہی میں اس کا اہل ہوں اور نہ ہی اس کا اہل متلے سے کوئی تعلق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سائل بہت دقیق ہیں اور ان کا سمجھنا ہر کس و نا کس کا کام نہیں۔ اہل غرابی اس طرح واقع ہوئی کہ ان نظریات کا پرچار اشعار کے ذریعے کیا گیا جو زبان زد عوام و عوام ہو گئے۔ اب خواص نے تو انہیں مضہم بھی کر لیا اور چپا چپا کر جزو بدن بھی بنالیا لیکن عوام کے لیے یہ زہرِ بلا بل بن گئے اور انہوں نے ان کو عمل سے گریزاؤ فرار کا بہانہ بنالیا۔

اقبال کا جہاد اصلاً ان نظریات کے اُن عمومی اخراجات ہی کے خلاف ہے جو حافظ اور جاتی کے اشعار کے ذریعے عوام کے اذہان پر ترسب ہوئے اور جن کے نتیجے میں امت کے ایک بڑے حصے میں سُکر جذب ہستی اور بالآخر فنا کا ذوق تو پیدا ہو گیا لیکن عمل اور جہاد کا جذبہ ختم ہوتا چلا گیا۔

فلسفہ خودی | ہستی سے علامہ مرحوم کے فلسفہ خودی نے مختلف بلکہ متضاد تشریحوں اور تعبیریں کے باعث ایک چھتیاں کی صورت اختیار کر لی ہے اور معاملہ بالکل ہی ہوا ہے کہ

ع "شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر را"

آسان تفہیم کے لیے یوں کہا جاسکتا ہے کہ علامہ کے فلسفے کا بنیادی پتھر انسان کی ہستی کی کنفی کے بجائے اثبات ذاتِ خویش ہے۔ نتیجہً ان کے پیش نظر سلوک کی انتہائی منزل فنا فی اللہ نہیں بلکہ بقا باللہ ہے۔ اس نکتے کی وضاحت کے لیے اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے میں خود علامہ مرحوم کی اس تحریر کے بعض حصے آپ کو سناتا ہوں جو انہوں نے پروفیسر نکلسن کی اس فرمائش پر کہ علامہ اپنے فلسفہٴ خیالات کو ایک مختصر لیکن جامع مضمون کی صورت میں بزبان انگریزی تحریر کر دیں، سپردِ قلم کی تھی اور جسے پروفیسر موصوف نے "مثنوی اسرارِ خودی" کے تحت جسے

(SECRETS OF THE SELF)

کے شروع میں شائع بھی کر دیا تھا (مطبوعہ ۱۹۲۱ء) اپنی اس تحریر میں علامہ فرماتے ہیں:

"ظاہر ہے کہ کائنات اور انسان کے بارے میں میرا یہ نظریہ بیکل اور اس کے سبب خیالوں اور ارباب وحدت الوجود سے بالکل مختلف ہے جن کے خیال میں انسان کا منتہا مقصود یہ ہے کہ وہ خدا یا حیاتِ کلی میں جذب ہو جائے اور اپنی انفرادی ہستی کو مٹا دے۔۔۔۔۔ میری رائے میں انسان کا اخلاقی اور مذہبی منتہا یہ مقصود نہیں ہے کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دے یا اپنی خودی کو فنا کر دے بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی

ہستی کو قائم رکھے... قرب الہی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان خدا کی ذات میں فنا ہو جائے بلکہ اس کے عکس یہ کہ خدا کو اپنے اندر جذب کر لے... میں نے افلاطون کے فلسفے پر جو تنقید کی ہے اس سے میرا مطلب ان فلسفیاء مذاہب کی تردید ہے جو بقا کے عوض فنا کو انسان کا نصب العین قرار دیتے ہیں... ان مذاہب کی تعلیم یہ ہے کہ مادہ کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس سے گریز کرنا چاہیے۔ حالانکہ انسانیت کا جوہر یہ ہے کہ انسان مخالف قوتوں کا مروانہ وار مقابلہ کرے اور انہیں اپنا خادم بنائے اس وقت انسان خلیفۃ اللہ کے مرتبے کو پہنچ جائے گا...

میں اگر اس حقیقت کو اپنے الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کروں تو وہ یوں ہوگی کہ اس پورے سلسلہ کائنات مادی اور تمام عالم کون و مکان کی طرح خود انسان کا مادی وجود یا اس کا وجود حیوانی بھی نہیں وہی و خیالی اور اعتباری محض ہے۔ سوائے اس کی اتنا یا سن یا ذات یا خودی کے جو دراصل عبارت اس کی اس روح سے جو اس کے وجود حیوانی میں پھونکی گئی اور جس کی اضافت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات کی طرف کی ہے۔ انجوائے آیہ قرآنی: "فَإِذَا اسْقَوْتَهُ وَنَفَحْتَ فِيهِ مِنْ رُوحِ فَقَعُولًا سَاجِدِينَ" یعنی جب میں اس کو پوری طرح درست کر دوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تب گر پڑنا اس کے لیے سجدے میں! — یہ روح انسانی نہ وہی و خیالی ہے نہ عارضی و فانی بلکہ حقیقی اور واقعی بھی ہے اور دائم و باقی بھی! خدا یا روح کائنات یا اناتے کبیر اور اس روح انسانی یا اناتے صغیر میں ایسا قریبی رابطہ اور لازم و ملزوم کا رشتہ ہے کہ انسان اسے

۱۱ یہاں علامہ مرحوم نے تَخَلَّلُوا بِاَخْلَاقِ اللہ کا حوالہ بطور حدیث رسول دیا ہے لیکن اصل یہ الفاظ کسی حدیث کے نہیں بلکہ صرفیہ کے ایک مشہور قول کے ہیں!

۱۲ غالباً یہی مفہوم ہے علامہ مرحوم کے اس مشہور مصرع کا کہ ع۔ یزداں بکمند آرد اسے بہت مروان!

۱۳ یا وسعت افلاک میں بحجیر مسلسل یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات!

۱۴ مذہب مروان خود آگاہ و خدا مست یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

۱۵ سورۃ النجم آیت ۲۹ اور سورۃ النحل آیت ۷۲

پہچان لے تو خدا کو جان جاتا ہے اور اگر اسے نہ پہچان پائے تو کبھی خدا کی معرفت بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ یا عکسایوں کہہ لیں کہ اگر کوئی خدا کو پہچان لے تو اپنی عظمت سے واقف ہو جاتا ہے اور اگر خدا کو بھلا دے تو اپنی حقیقت بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

خالق و مخلوق اور عبد و معبود یا امانے کبیر اور امانے صغیر یا علامہ کے الفاظ میں امانے مطلق (INFINITE EGO) اور امانے محدود (FINITE EGO) کے امین اصل رشتہ باہمی عشق اور محبت کا ہے بلغمائے آیات قرآنی:

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدَّ
حُبًّا لِلَّهِ (البقرة: ۱۶۶)
إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ
فِي سَبِيلِهِ (الصق: ۵)
اور (حقیقی) ایمان والے سب سے زیادہ
شدید محبت کرتے ہیں خدا کے ساتھ!
یقیناً اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے اُن لوگوں سے
جو جنگ کرتے ہیں اس کی راہ میں.....

اور اسی باہمی رشتہ الفت و محبت کا منظر خارجی ہے جسے قرآن ولایت باہمی سے تعبیر کرتا ہے:

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا (البقرة: ۲۵۸)
أَلَا إِنَّ أَقْرَبَ لِلَّهِ لَأَخَوْفُ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (یونس: ۸۴)
اللہ اہل ایمان کا ولی ہے۔
آگاہ ہو جاؤ اللہ کے دلوں کے لیے نہ کوئی
خوف ہے نہ حزن!

ابن ظاہر ہے کہ جس کسی کو اس عشق کی حقیقی لذت حاصل ہو گئی وہ اس کے دوام و بقا کا خواہشمند

ہو گا نہ کہ اس کے انقطاع اور خاتمے کا! اور ظاہر ہے کہ بقائے عشق بقائے ذات پر منحصر ہے اور

۱۔ یہ ترجمہ صوفیاء کے اس مقولے کا جو محمد عیسیٰ بن مرسل کی حیثیت سے بیان کر دیا جاتا ہے یعنی:

”مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ“

۲۔ یہ ترجمہ آیت قرآنی کا ”وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ“

أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ (سورة البقرات: ۱۹)

۳۔ اس آیت کریمہ کو پڑھتے ہوئے میرا ذہن علامہ مرحوم کے اس شعر کی جانب لانا منتقل ہو جاتا ہے کہ

محبت مجھے ان جانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کسند!

فنائے ذات کا لازمی نتیجہ خاتمہ عشق ہے جس میں سے علامہ مرحوم کے فلسفے کا دوسرا اہم نکتہ سمجھیں
اسکتا ہے یعنی عشق خداوندی اور اس کا دوام اور محبت الہی اور اس کا ”سوزِ ناتمام“۔

تو نہ شناسی ہنوز شوقِ بیدرد وصل چیتِ حیاتِ دوام ہے سوختنِ ناتمام (۷)
یا دوام باز سوزِ ناتمام است چو مایہ جز پیشِ برا حرام است! (۸)
یا ہر لحظہ نیا طور، نئی برقی تجلی، اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے!

الغرض اثباتِ ذاتِ خویش اور دوامِ عشقِ الہی علامہ مرحوم کے فلسفہِ خودی کے دونوں
ہیں اور یہ دونوں ظاہر ہے کہ باہم لازم و ملزوم ہیں۔ علامہ کے ان دو اشعار میں ان کا یہ باہمی لزوم
بہت نمایاں ہے یعنی۔

میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حسن دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی!

اور

نہ ہو طغیانِ ششانی تو میں رہتا نہیں باقی کہ میری زندگی کیا ہے یہی طغیانِ ششانی!
یہ عرض کرنا تحصیلِ حاصل ہے کہ اسی عشقِ الہی کا ایک عکس عشقِ رسول بھی ہے۔ اس لیے کہ کلن
ہے جو نہیں جانتا کہ اطاعت و محبت دونوں کے اعتبار سے اللہ اور رسولؐ ایک وحدت کی حیثیت
رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ مرحوم کے کلام میں عشقِ رسولؐ کا جذبہ تانے بانے کے مانند
پیوست ہے۔ جیسے۔

ہر کہ عشقِ مصطفیٰ سامانِ لوت بھر و بر در گوشہ دامنِ اوست! (۹)
یا مصطفیٰ براں خویش را کہ دیں بر اوست اگر باوند رسیدی تمامِ لب بھی است! (۱۰)
روحِ شریعت: عشقِ الہی | روحِ دین کی تعبیر کے ضمن میں، جیسا کہ میں نے پہلے
عرض کیا تھا، علامہ مرحوم کی دوسری بڑی خدمت یہ ہے

کہ انہوں نے بڑی رسم پرستی اور خشک فقہی و قانونی موشگافی کی پرزور مذمت کی اور دین و شریعت کے
جملہ مظاہر کی اصل روحِ باطنی عشقِ الہی کو قرار دیا۔ اپنے مرشد کے اتباع میں جس نے لغو لگایا تھا کہ
شاد باد اے عشقِ خوش سولے! اے طیبِ جلدِ عقلت اے! (۱۱)

انہوں نے بھی واضح کاف الفاظ میں کہا ہے

عقل دل و نگاہ کا شہدائیں ہے عشق
عشق ہر تو شرع و دین یکجہ تصورات!

اور

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا نام
میرا سجد بھی حجاب ہیرا قیام بھی حجاب!

اور فریاد کی کر

بکھی عشق کی آگ اندھیر ہے
سلمان نہیں راکھ کا ڈھیر ہے
یا روگئی رسم اذان، روح بلائی نہ رہی
فلسفہ گیا، تلقین غزالی نہ رہی
اس لیے کہ جملہ اعمال کی روح عشق الہی ہے۔ اسی کی لپک بلال کی اذان میں بھی اور اسی کی دیک
تلقین غزالی میں! بقول علامہ مرحوم:۔

مرد خدا کا اکل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات، موت اُس پر حرام
عشق دم جبریل، عشق دل مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق فقیہ حرم، عشق امیر جنود
عشق ہے ابن ایل، اس ہزاروں تمام
عشق کے صراط ہے نغمہ تار حیات
عشق سے نور حیا، عشق سے نجات!

اور

صدقِ ظہیر بھی عشق، صبرِ حسین بھی عشق!
معوذہ وجود میں بدرِ حُنین بھی عشق!

۲۔ نظامِ دین کی توضیح و تفسیر | نظامِ دین حق کی جو تشریح علامہ مرحوم کے کلام میں نظر
آتی ہے اسے بغرض تفہیم تین اجزاء میں تقسیم کیا جاسکتا

ہے، اور یہ تینوں درحقیقت ایک ہی مرکزی نکتے کی شرح اور ایک ہی نقطہ توحید کی توسیع (Extension)
کی حیثیت رکھتے ہیں:

۱۔ تیسب کیا ہیں، بغض و اک نہتہ ایمان کی تفسیر! ۱

(۱) مثلاً عام تمدنی اور معاشرتی سطح پر وحدتِ خالق ہی وہ اساسی تصور ہے جس سے وحدتِ انسانی
کا خیال جنم لیتا ہے اور جس میں مزید گہرائی و گیرائی وحدتِ آدم کے تصور سے پیدا ہوتی ہے اور نتیجہً انسانی
حریت، اخوت اور مساوات کے اصول متبطل ہوتے ہیں، چنانچہ نظامِ دین حق کے اس پہلو پر بہت زور
علامہ کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ میں اس وقت طوالت کے خوف سے ان دو اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔

مردم کو من کی شان میں علامہ مرحوم فرماتے ہیں :

(۱۲) كُلُّ مُؤْمِنٍ اخُوٌّ لِّمَنْ دُونَهُ جُزْئِيَّةً سِرَّيَّةً آبٌ وَغُلَشٌ

(۱۳) نَاشِئِيَّةً اَسْتِیَازَاتِ اَمَدِهِ وَرَنْهَادِ اَوْ سَاوَاتِ اَمَدِهِ

(ب) اسی طرح ہیئت سیاسی کے ضمن میں توحید الہی ہی کے اصل الاصول سے مستنبط ہوتا ہے یہ اسی قاعدہ کہ حاکمیت صرف خدا کے لیے ہے، ماریوئی کی حاکمیت پر مبنی نظام سیاسی محترم شرک ہے۔ غور کیجئے کہ کتنے سادہ لیکن پر شکوہ الفاظ میں ادا فرمایا ہے علامہ مرحوم نے یہ قاعدہ کلیہ :

سروری زیا فقط اُس ذات بلے ہٹا کو ہے حکمراں ہے اک وہی باقی بستان آوری

کسی ہیئت سیاسی میں تصور حاکمیت کے بعد سب سے اہم مسئلہ ”امر جامع“ کا ہے یعنی یہ کہ اُس ہیئت سیاسی میں شریک افراد کو باہم ایک دوسرے سے جوڑنے والی چیز کون سی ہے! اس ضمن میں اس زمانے میں وطنی قومیت کا جو تصور پوری دنیا میں رائج ہے، حیرت ہوتی ہے کہ علامہ مرحوم نے اس کی شاعت کا احساس کس شدت سے کیا اور اس شجر خبیثہ کی خباثت کا کس قدر صیح اندازہ لگایا۔ سنئے اور سو ڈھنیے :

اس دور میں مے اور ہے جامِ ابد ہے جہاؤ ساقی نے بنا کی روشِ نطف و ستم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیروں اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کر تاشیدہ تہذیبِ لوی ہے غارت گر کا شانہ دینِ نبوی ہے

بازو تر آوجید کی قوت سے قوی ہے اسلام تراویں ہے تو مصطفوی ہے

نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے

اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

(ج) یہی معاملہ نظام معیشت کا بھی ہے۔ توحید کا اصول جس طرح حاکمیت اور قومیت کے تمام فرقہ

تصورات کی نفی کئی ہے، اسی طرح ملکیت مطلقہ کے عام تصور کی بھی کامل نفی ہے۔ ظاہرات ہے کہ

اگر ہمک ”اللہ کا ہے تو ہمک“ بھی اللہ ہی کی ہے اور اگر زمین و آسمان اور جو کچھ ان دونوں میں ہے اس

سب کا "ملک" بادشاہ، اللہ ہے تو یقیناً مالک بھی اللہ ہی ہے۔

گویا انسان خود بھی اللہ کا ہے (إِنَّا لِلّٰہِ) اور جو کچھ اس کے پاس ہے، خواہ وہ اس کی اپنی ذات اور اس میں مخفی قوتیں، صلاحیتیں اور اس کی مہلت عمر ہوں، خواہ اس کا مال و اسباب یا زمین و جائیداد سب اصلاً اللہ کی ملکیت ہیں اور اس کے پاس اللہ کی امانت جس میں تصرف کا اختیار تھا سے دیا گیا ہے لیکن اصل مالک کے احکام کے اندر اندر۔ ملکیت کے بجائے امانت کا یہ تصور توحید کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے جس سے کوئی فرار ممکن نہیں۔ بقول شیخ سعدیؒ:۔

ایں امانت چہند روزہ نزد ماست

در حقیقت مالک ہر شے خداست (۱۱۳)

انہوں نے کہ جب دین الہی کے چہرے پر از مہر و مطیٰ کے جاگیر دارانہ نظام کی نقاب پرگشتی تو اس کے روتے منور کے دوسرے خدو و خال کی طرح یہ حقیقت بھی نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی اور یہ علامہ مرحوم کی ژرف نگاہی اور حقیقت بینی کا شاہکار ہے کہ انہوں نے نکتہ توحید کی اس لازمی توسیع (EXTENSION) کو بھی حد درجہ واضح الفاظ میں بیان کر دیا:۔

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف منعوں کو مال و دولت کا بنانا ہے ایس
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ تیریں

اور۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھتم سے باد ساز گار؟ خاک پر کس کی ہے ہر کس کا ہے یہ نور آفتاب؟
کس نے بھڑی موتیوں سے خوشہ گندم کی جیبا؟ موسوں کو کس نے سکھلاتی ہے غوئے انقلاب؟

وہ خدا یا ایہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں!

تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں!

صرف یہ بلکہ مرحوم نے اس اصول کو بھی بہت وضاحت کے ساتھ پیش فرمایا جو تاریخ و زمانہ کے دوران پہلی بار خلافت راشدہ کے زمانے میں حضرت عمرؓ کی زبان مبارک سے ادا ہوا تھا، یعنی ریاست کی جانب سے تمام شہریوں کی کفالت عامہ۔ علامہ فرماتے ہیں:۔

کس نباشد در جہاں محتاج کس نکتہ شرع میں ایں است و بس ! (۱۵)

اور

جو حرف قبل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار !
اس سلسلے میں حرف آخر کا درجہ رکھتے ہیں علامہ مرحوم کے یہ اشعار :

چیت قرآن و خواجہ را پیغام مرگ و شگیر بندہ بے ساز و برگ ! (۱۶)

پہچ خیر از مردک زرکش مجو ! لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا (۱۷)

از ربا آخسہ چمی زاید بہ فتن ! کس نداند لذتِ قرضِ حسن (۱۸)

از ربا جاں تیرہ دل چوں خشتِ سنگ آدمی دزدہ بے دندان و چنگ (۱۹)

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست ایں 'متاع' بندہ و ملک خداست (۲۰)

بندہ مومن ایں حق مالک است غیر حق ہر شے کہ بینی مالک است (۲۱)

رأیت حق از ملوک آمد بگوں قریہ از دغلِ شاں خوار و زبوں (۲۲)

آب و نان است از یک مادہ

دَوْدَةُ آدَمَ "كَفَشَ وَاحِدَهُ" (۲۳)

نفسِ قرآن تا دریں عالم نشست نفسِ امارت کا ایں و پا پاشکست (۲۴)

باسلام گفت جاں بر کف بندہ ہرچہ از حاجتِ فزوں داری بدہ (۲۵)

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است

ساز قرآن را نوام باقی است (۲۶)

۱۔ اشلہ اس حدیث نبوی کی طرف جس میں خبر دی گئی ہے کہ ایک نماز آئے گا کہ اسلام میں سے سوائے
اس کے نام کے کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے بھی سوائے اس کے رسم الخط کے کچھ باقی نہ رہے گا۔

(رواہ البیہقی عن علی)

(۴) اقبال اور قرآن

اب میں اس چوتھی اور آخری بات کے بارے میں کچھ عرض کر کے اپنی گزارشات ختم کر دوں گا جس کے ضمن میں میں نے ابتداء میں یہ عرض کیا تھا کہ میرا گمان ہے کہ مجھے علامہ مرحوم کی روح سے ایک خصوصی نسبت حاصل ہے۔ یعنی مرحوم کا تعلق قرآن حکیم سے اس موضوع کا اہم ترین جھڑ تو پہلے ہی زیر بحث آچکا ہے یعنی یہ کہ علامہ مرحوم کی حیثیت فی الواقع "ترجمان القرآن" کی ہے اور جیسا کہ خود اُن کا دعویٰ ہے ان کا فکر بھی قرآن ہی پر مبنی ہے اور ان کا پیغام بھی قرآن ہی سے ماخوذ ہے لہذا اب میں اس موضوع کے بعض ضمنی منکر نہایت اہم پہلوؤں کی طرف آپ حضرات کی توجہ مبذول کرواؤں گا۔

۱: عظمت قرآن کا نشان | اس سلسلے میں سب سے پہلی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ میرے نزدیک اس دور میں علامہ مرحوم کی شخصیت عظمت

قرآن کے ایک عظیم علم اور نشان (SYMBOL) کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ ایک عالم آدمی کا متواتر عقیدے کے طور پر قرآن مجید کو اللہ کی کتاب ماننا اور بات ہے اور ایک ایسے شخص کا قرآن پر وثوق و اعتماد اور ایمان و یقین جو فکر انسانی کی تمام وادیوں میں گھوم پھر چکا ہو اور مشرق و مغرب کے تمام فلسفے کھنگال چکا ہو، بالکل دوسری بات ہے۔

سب جانتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل اور عظیم ترین معجزہ قرآن حکیم ہے۔ اب خود اعجاز قرآنی کے پہلو بے شمار اور بے حد و نہایت ہیں جن کا احاطہ یا احصاء کسی فرد بشر کے لیے ممکن نہیں۔ اور میرے نزدیک اس دور میں اعجاز قرآنی کا عظیم ترین مظہر یہ ہے کہ وہ کتاب جسے دنیا کے سامنے آج سے چودہ سو برس قبل عرب کے ایک اُمّی شخص (صلی اللہ علیہ وسلم و فدائے الہی و اُمّی) نے پیش کیا تھا آج بھی جبکہ دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے، اُدی علوم استہائی بلندی کو چھو رہے ہیں اور علم و ہنر کی دنیا میں انقلاب آچکا ہے، نوع انسانی کی ہدایت و رہنمائی کی جملہ ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے!

اور اسی کی ایک گواہی اور شہادت ملتی ہے علامہ مرحوم کی زندگی سے کہ ایک شخص جس نے انیسویں صدی کے اداس و غمناک شعور کی آنکھ کھولی۔ پھر یہ نہیں کہ پوری زندگی بھروسہ اللہ کے گنبد ہی

رہزناں از حفظ او رہبر شدند از کتابے صاحب دفتر شدند (۳۱)
 آنکو دوشس کوہ بارش برنافت سطوت اوزہرہ گردوں شکافت (۳۲)
 اور سوچئے کہ کیا اس کلام میں دور دور بھی کسی آدم کا سراغ ملتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آدمی آج
 ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ قابل کا قول نہیں، حال ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ”از دل خیز درزل
 ریزہ کی اعلیٰ مثال ہے۔

اور اسی پس نہیں آگے بڑھے اور نیچے:

س فاش گویم آنچه در دل مضمر است این کتابے نیت چیزے دیگر است (۳۳)
 مثل حق پہاں وہم پیدا است این زندہ و پائندہ دگواست این (۳۴)
 صد جہاں تازہ در آیات اوست عصر ایچیدہ در آفات اوست (۳۵)
 بات کتنی سیدمی اور سادہ معلوم ہوتی ہے، قرآن عام معروف معنوں میں کتاب نہیں بلکہ
 کلام ہے اور کلام خود کلم کی صفت اور اس کی جملہ صفات کا مظہر ہوتا ہے۔ لہذا قرآن مثل ذات
 باری تعالیٰ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی اور زندہ بھی ہے قائم و دائم بھی۔ پھر ذات باری ذات
 مکان کی مقتیدہ ہے نہ کلام الہی ان کا پابند، بلکہ جیسے خود اللہ تعالیٰ ’اول‘ بھی ہے اور ’آخر‘ بھی اور ’ان‘
 مکان کل کے کل وجود باری میں ’گم‘ ہیں، اسی طرح کلام الہی کے بھی ’سید زبوں‘ کا درجہ رکھتے ہیں اور
 جس طرح اللہ کی شان یہ ہے کہ ”کُلُّ یَوْمٍ هُوَ فِی شَأْنِ“ اسی طرح قرآن حکیم بھی ہر
 دور کے حق پر ایک خود شید تازہ کے مانند طلوع ہوتا رہے گا لیکن واقعہ یہ ہے کہ کم از کم میرے محدود
 علم اور مطالعے میں قرآن حکیم کی اس سے زیادہ مدح و ستائش ہماری پوری تاریخ میں موجود نہیں۔!
 اب ظاہر ہے کہ تعریف معرفت کی مناسبت ہی سے کی جاسکتی ہے۔ پس اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ
 عظمت قرآنی کے کتنے بڑے عارف تھے علامہ اقبال مرحوم!

اور یہیں سے سمجھیں آسکتی ہے یہ بات کہ کیوں اس قدر کہ تھا علامہ مرحوم کو امت کی قرآن
 مجید کی جانب عدم توجہ کی روش سے جس کا مرثیہ ان کے کلام میں جا بجا موجود ہے، اور کیوں ان کا

دلِ حساس خون کے آنسو دوتا ہے اس پر کہ مسلمانوں کو، عام اس سے کہ وہ عوام میں سے ہوں یا خواص میں سے، متکبران سے نہ اعتنا رہے نہ دلچسپی! غور فرمائیے کہ کتنی کمبختی ہے علامہ کے اس شعر میں کہ :-

بایاتش ترا کارے جزایں نیست!

کہ از یاسین او آساں بمیری!! (۳۶)

اور کس قدر صحیح نقشہ کھینچا ہے علامہ مرحوم نے امت مسلمہ کے مختلف طبقات کا :-

صوفی پشیمین پوش حال مست از شرابِ نغمہٗ قوال مست! (۳۷)

آتش از شیرِ عراقی در دیش درنی مازد بستر آں مخلص (۳۸)

مہمّظ دستاں زنِ افسانہ بند معنی اولیت و حرفِ او بلند (۳۹)

از خطیب و دہلی گفت درلو با ضعیف و شاذ و مرسل کار او (۴۰)

رہے فقیہانِ حرمؔ تو ان کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ :-

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں ہوئے کس درہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

لہذا اب عوام کا تو کہنا ہی کیا، وہ غریب تو ہیں ہی کشتہٗ مملاتی و سلطانی و میری! ان کی عظیم اکثریت بے ذوق بھی ہے اور بے طلب بھی، اور بقول علامہ مرحوم :-

صاحبِ قرآن و بے ذوقِ طلب! العجب، ثم العجب، ثم العجب! (۴۱)

اور ظاہر ہے کہ یہاں طلب سے مراد تعمیرِ خودی کی طلب بھی ہے اور غلبہٗ حق کی آرزو بھی، اس لیے کہ فی زمانہ یہی دونوں نایاب ہیں اور انہی کا حال یہ ہے کہ :-

آرزوِ اول تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں

ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام

رہی دنیوی آرزوؤں اور طولِ اہل کا جال تو اس میں تو ہر شخص ہی ہے کہ ہستم اسیرِ کندہٗ ہوا کے مصداق بری طرح جکڑا ہوا ہے۔

تبتِ اسلامی کے اس حالِ زبوں کے بارے میں علامہ فرماتے ہیں:

پیشِ مایک عالمِ فرسودہ است تبتِ اندر خاکِ او آسودہ است (۴۲)

رفت سوزِ سینہ تا مار و کرد یا سلاں مرویاتِ سلاں بمرد! (۲۳)

علامہ مرحوم کے نزدیک قرآن سے بہی دُوری اور کتاب الہی سے
بہی بُعد اصل سبب ہے مسلمانوں کے زوال و انحلال کا اور امت

۳: داعی الی القرآن

مسلمہ کے محبت و اخلاص اور ذلت و خواری کا اُجواب شکوہ میں جو بات انہوں نے صدرِ جہ
سادہ الفاظ میں فرمائی تھی کہ:-

وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر اور تم خوار ہونے تارکِ سلاں ہو کر
بعد میں اُس کا اعادہ نہایت پر شکوہ الفاظ اور صدرِ جہ درد انگیز اور حسرت آمیز یہ اپنے میں لُح کا لُ

خوار از ہجودی قسماں شدی شکوہ بیچ گردشِ دُوراں شدی (۲۴)

اے چو شبنمِ بر زمیں افتندہ درِ نسل داری کتابِ زندہ (۲۵)

اور اب اُن کے نزدیک اسی "کتابِ زندہ" سے وابستہ ہے ان کا "احیا" اور اسی پر دار و مدار ہے
ان کی نشاۃ ثانیہ کا؛ گویا مسلمانوں کی حیاتِ تازہ کا انحصار ہے ان کے از سر نو حقیقتاً مسلمان ہونے

پر اور ان کے مسلمان ہونے کا دار و مدار ہے قرآنِ حکیم پر ————— یا یوں کہ لیں کہ طبع

اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ وابستہ ہے "احیائے اسلام" سے اور "احیائے اسلام" وابستہ ہے "احیائے قرآن"

سے جو عبارت ہے مسلمانوں کے اس کے ساتھ صحیح تعلق کی از سر نو استواری سے اعلان فرماتے ہیں:

اے گرفتارِ رسومِ ایمان تو شیوہ دے کافرِ زندانِ تو! (۲۶)

قطع کر دی اُمرو خود را در ذُبُو جادہ پیائی اِلٰی شعیبۃ شکر (۲۷)

گر تومی خواہی مسلمان زبیتن نیست ممکن جز بقراں زبیتن (۲۸)

از تلاوتِ بر تو حق دارد کتاب

تو از د کلمے کہ می خواہی بیاب (۲۹)

علامہ کے نزدیک علم ہے تو صرف علمِ قرآنی اور حکمت ہے تو صرف حکمتِ قرآنی اور یہی

ہجوری کا لفظ استعمال کر کے علامہ قاسمی کے ذہن کو قرآن مجید کی اس آیت کی طرف منتقل کرنا چاہتے ہیں:-

وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُودًا ۝ (الفرقان آیت ۳۰)

علم و حکمت قرآن ہے جو اگر کسی کے ذہن میں سرایت کر جائے اور قلب میں رچ بس جائے تو اس کے باطن میں ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے جو منہج ہوتا ہے ظاہر کے انقلاب پر اور یہی وہ عمل ہے جو بالآخر ایک عالمی انقلاب کو جنم دے سکتا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم وہ کتاب ہے کہ :

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود

جاں چوں دیگر شد، جہاں دیگر شود (۵۰)

اور کس خوبصورتی سے مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ اس قرآن کے ذریعے ایک عالمگیر انقلاب برپا کرنے کے لیے کمر بستہ ہو جاؤ :

بندۂ مومن ز آیات خداست (۵۱) ایں جہاں اندر براؤچوں قباست !

چوں کہن گر در جہانے در برش (۵۲) می دہرستاں جہانے دیگرش

یک جہانے عصر حاضر ایں است ! (۵۳) گیر اگر در سینہ دل معنی رس است !

اور کہیں للکار تے اور غیرت دلاتے ہیں کہ :

اے کہ می نازی بہ قرآن عظیم (۵۴) تا مجاور مجرہ باشی مستقیم ؟

در جہاں اسرار دیں را فاش کن (۵۵) نکتہ شرع میں را فاش کن !

علامہ کے نزدیک تطہیرِ ذہن اور تعمیرِ فکر کا واحد ذریعہ تو یہ ہے کہ ”اسرار دیں“ فاش کیے جائیں اور نوعِ انسانی کے سامنے ”نکتہ ہائے شرع میں“ کی وضاحت کی جائے، خود تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح کا کارگر اور ترموژ ذریعہ بھی قرآن حکیم ہی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

کشتن ابلیس کارے مشکل است (۵۶) زانکہ او گم اندر اعماق دل است

خوشتر آن باشد مسلمانش کئی (۵۷) کشتہ شمشیر قرآنش کئی

اور

جز بقراں ضیعی روا ہی است (۵۸) فقر قرآن اصل شاہنشاہی است

فقر قرآن اختلاط ذکر و فکر (۵۹) فکر را کامل ندیم جُشنِ بندِ کر

لیکن یہ ذکر صرف زبان سے ہی نہیں پورے وجود سے ہونا چاہیے :

ذکر بہ ذوق و شوق را داؤن ادب (۶۰) کارِ جان است ایں نہ کارِ کام و لب

الغرض علامہ کے نزدیک اُمت کے جملہ امراض کے لیے نسخہ شفا بھی قرآن حکیم ہے اور
ملت کے تن مردہ میں از سر نو جان ڈالنے کے لیے آپ حیات بھی چشمہ قرآنی ہی سے حاصل
ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

- برخود از قرآن اگر غواہی ثبات در ضمیرش دیدہ ام آپ حیات (۶۱)
می دہد مارا پیغم لا تَحْخَفُ می رساند بر مستم لا تَحْخَفُ (۶۲)
گوهر دیا نے قرآن مستم شرح رمز صِبْغَتُ اللہ گفتم (۶۳)
فکر من گردوں میر از فیض اوست جوئے ساحل نا پذیر از فیض اوست (۶۴)
پس بگیر از بادۂ من یک دو حباب
تا درختی مشیل تیغ بے نیام! (۶۵)

اور

- از یک آئینی مسلمان زندہ است پیچہ ملت ز قرآن زندہ است! (۶۶)
ماہر خاک و دل آگاہ اوست اعتماش کن کہ جُلَّ اللہ اوست (۶۷)
چوں گہر در رشتہ او سفتہ شوا
دردنہ مانند غبار آشفستہ شوا (۶۸)

گویا اچانے دین کی جدوجہد ہو یا تجدید ملت کی سعی، علامہ مرحوم کے نزدیک اس کام کے مجدد
ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ ہے قرآن مجیم، اور یہی معنی ہیں قرآن حکیم کی اس آیت کے جو نبی اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق کار اور منہج انقلاب کی وضاحت کے ضمن میں معمولی سے لفظی فرق کے
ساتھ قرآن مجید میں چار مقامات پر وارد ہوئی ہے یعنی: يَسْأَلُوا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهِمْ وَيُكَيِّفُوهُمْ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ اور یہی ہے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے
کرنے کا وہ اصل کام جس پر ایک طویل عرصے تک ادھر ادھر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد بالآخر
میری نگاہ جم گئی ہے کہ جائیں جا است!

۱۔ یہ دراصل نام ہے میرے ایک کتابچے کا جو میری اس تحریر پر مشتمل ہے جو میں نے جون ۱۹۷۰ء میں
(باقی ماثیہ اگلے صفحہ پر)

آخر میں میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے آپ کا بہت سا وقت لے لیا اور ساتھ ہی آپ سب کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری ان گزارشات کو صبر اور سکون کے ساتھ سنا۔ خود میں نے جو محنت اس سلسلے میں کی ہے اس کا اہل سبب یہ ہے کہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ پاکستان کے بقاؤں کا ملت اسلامی کی تجدید و نشاۃ ثانیہ اور دین حق کے احیاء و اظہار لیے اہم اور حلیل مقاصد کے ضمن میں علامہ اقبال کے فکر اور پیغام کی اشاعت کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے اور پاکستانی عوام میں العلوم اور نوجوان نسل میں بالخصوص جو بعد رفتہ رفتہ علامہ مرحوم کی شخصیت اور افکار و نظریات سے پیدا ہوتا جا رہا ہے، حالات کا ایک شدید تقاضا ہے کہ اسے کم کرنے کی کوشش کی جائے۔ آپ چاہیں تو اسے احيائے اقبال کا نام دے لیں۔ بہر حال یہ وقت کی ایک اہم ضرورت اور اسی کی ایک حقیر سی سہی ہے جو میں نے کلام اقبال سے یہ مواد جمع کر کے مرتب صورت میں آپ کے سامنے پیش کر کے کی ہے۔

اب اگر میری ان گزارشات سے آپ میں لے کسی ایک کے دل میں بھی یہ جذبہ بیدار ہو جائے اور ایک عزم متعمد پیدا ہو جائے کہ وہ قرآن ایتھ میں لے کر ایک عالمگیر اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو، تب تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت پوری طرح پھل ہوگئی اور گونا گونا گوں ازاد رنگی، خویش کارے کر دم، اور اگر بدرجہ ادنیٰ میری ان گزارشات سے آپ حضرات کے دلوں میں کلام اقبال کے مطالعے ہی کا شوق بیدار ہو جائے تب بھی میں یہ جانوں گا کہ میری محنت کم از کم ضائع نہ ہوئی۔ وَآخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

’مثنوی کے صفحات میں لکھی گئی اور جو میری موجودہ سرگرمیوں کے لیے بمنزلہ اساس ہے۔ اس کے اب تک آٹھ ایڈیشن اسلام کی نشاۃ ثانیہ، کرنے کا اہل کام کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ برادر عزیز ڈاکٹر انصار احمد نے کیا ہے، جسے کتب خانہ نے شائع کیا ہے۔ (اسرار احمد)

هُوَ الَّذِي ارْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ

(التوبة: ۳۳، الفتح: ۲۸، القصص: ۱۹)

ادو ترجمہ اشعار فارسی

- (۱) ایک بہمن زادہ (یعنی علامہ اقبال خود) روم (مراد ہیں مولانا رومی) اور تبریزی (مراد ہیں شمس تبریزی) کے علوم کا حامل اودان کے اسرار و رموز سے واقف ہے۔
- (۲) و (۳) مثنوی مولوی معنوی یعنی مثنوی مولانا روم دراصل فارسی زبان میں قرآن ہی کی ترجمانی ہے اور میں ان (مولانا روم) کی صفات اس کے علاوہ اور کیا بیان کروں کہ وہ اگرچہ پیغمبر نہیں ہیں لیکن انہیں کتاب بہر حال عطا ہوئی ہے۔
- (۴) تا (۶) اگر میرے دل کی مثال اس آئینے کی سی ہے جس میں کوئی جوہری ذہو، اور اگر میرے کلام میں قرآن کے سوا کسی اور کی ترجمانی ہے تو (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) آپ میرے فکے ناموس کا پردہ خود چاک فرمادیں اور اس چمن کو مجھ ایسے خار سے پاک کر دیں (مزید برآں) حشر کے دن مجھے خوار و روا کر دیں اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) مجھے اپنی قدم بوسی کی سعادت سے محروم فرمادیں!
- (۷) تو ابھی اس راز سے آگاہ نہیں ہوا کہ وصل سے شوق ختم ہو جاتا ہے۔ دکاش کہ تو جان لے کہ ہمیشہ کی زندگی کیا ہے پسلسلہ لگتے رہنا! (نہ کہ ایک بار بھٹک کر ختم ہو جانا!)
- (۸) ہماری بقا لگتے رہنے ہی میں ہے۔ اور ہم پر مچھلی کی طرح تپتے رہنے کے سوا ہر شے عارم ہے۔
- (۹) جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کی دولت حاصل ہے تو گویا دنیا کا گل خشک و تر اس کے دامن کے ایک گوشے میں موجود ہے۔
- (۱۰) خود کو در مصطفیٰ تک پہنچا کر دم لو۔ اس لیے کہ اگر تم اس مقام تک نہ پہنچ سکے تو سمجھ لو کہ پھر بولہبی کے سوا اور کچھ اتھ نہ آ سکے گا!
- (۱۱) اے برے جذبہ عشق! اے میری عزیز متاع اور اے میرے جملہ امراض کے معالج، تو مدد شاد و آباد رہے!

(۱۲) و (۱۳) اس کے (یعنی بندہ مومن) کے دل میں یہ حقیقت جاگزیں ہے کہ ”تمام اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں! اسی طرح جذبہ صریت بھی اس کے ضمیر میں رچا ہوا ہے، وہ انسانی یا علاقائی، امتیازات سے بالکل ناواقف ہے اور مساوات اس کی سرشت میں موجود ہے!

(۱۴) یہ (میرا جملہ مال و اسباب دنیوی) میرے پاس ایک عارضی امانت ہے، ورنہ ہر شے کا مالک حقیقی تو خدا ہی ہے!

(۱۵) شریعت حقہ اور نظام اسلامی کا اہل تصویب یہی ہے کہ دنیا میں کوئی کسی کا محتاج نہ رہے۔

(۱۶) (جانتے ہو؟) قرآن کی حقیقت کیا ہے؟ سرمایہ دار کے لیے موت کا پیغام اور بے سرو سامان لوگوں کا سہارا و آسرا!

(۱۷) دولت سیٹھنے والے سے کسی بھلائی کی توقع نہ کرو۔ (اس لیے کہ قرآن نے صاف فرمادیا ہے کہ) تم نیکی کا مقام ہرگز حاصل نہیں کر سکتے جب تک (بجائے سیٹھنے اور جمع کرنے کے) خرچ کرنے کی عادت نہ ڈالو!

(۱۸) سود سے سوائے فساد کے اور کس چیز میں اضافہ ہو سکتا ہے؟ (افسوس کہ) بغیر سود قرض دینے کی لذت کسی کو معلوم نہیں!

(۱۹) سود سے روح تاریک اور دل اینٹ پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے اور انسان بغیر ذاتوں اور پنجوں کے (زندہ بن جاتا ہے۔

(۲۰) زمین سے اپنے لیے رزق کا حصول جائز ہے۔ (لیکن) یہ انسان کے لیے صرف استعمال کی چیز ہے، ملکیت صرف خدا کی ہے۔

(۲۱) بندہ مومن (اپنے مال و متاع کا صرف) امین ہے، مالک خدا ہے۔ خدا کے ہوا جو کچھ دیکھتے ہو سب فانی اور ہلاک ہو جانے والا ہے!

(۲۲) حق کا پرچم بادشاہوں کے باعث نچا ہو جاتا ہے اور ان کی وجہ سے بستیاں کی بستیاں خوار و بچال ہو جاتی ہیں۔

(۲۳) ہمارا آب و دانہ ایک ہی دسترخوان سے ہے۔ اس لیے کہ آدم کا پورا خاندان ایک

جان کے مانند ہے۔

(۲۴) جب اس دنیا میں قرآنی تعلیمات کا سکہ چلا تو کہانت اور پاپائیت ایسے تمام گمراہ کن سلسلوں کا زور ٹوٹ گیا۔

(۲۵) مسلمانوں سے کہو کہ جان بھٹیلی پر رکھ لیں (یعنی قتال فی سبیل اللہ کے لیے کمر لیں) اور جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہو وہ سب (اللہ کی راہ میں) دے ڈالیں!

(۲۶) لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہو سکتا اس لیے کہ ہمارے محفل ساتی اور شراب سے تہی دست رہ گئی ہے یعنی قرآن کے ساز کی صرف آواز ہی آواز باقی رہ گئی ہے!

(۲۷) وہ زندہ کتاب قرآن مجیم جس کی حکمت لازوال بھی ہے اور قدیم بھی!

(۲۸) زندگی کے وجود میں آنے کے رازوں کا خزینہ جس کی حیات افروز اور قوت بخش تاثیر سے بے ثبات بھی ثبات و دوام حاصل کر سکتے ہیں۔

(۲۹) اس کے الفاظ میں نہ کسی شک و شبہ کا شائبہ ہے نہ رد و بدل کی گنجائش۔ اور اس کی آیات کسی تاویل کی محتاج نہیں۔

(۳۰) نور انسانی کے لیے (خدا کا) آخری پیغام جس کے لانے والے تمام جہانوں کے لیے رحمت قرار پائے (صلی اللہ علیہ وسلم)!

(۳۱) اسے یاد کر لینے کے باعث یا اس کی حفاظت میں آکر رہن اور لیٹرے رہبر و رہنما بن گئے اور اس ایک کتاب کے طفیل وہ خود بہت سی کتابوں کے مصنف بن گئے!

(۳۲) وہ (کتاب) کہ جس کے بوجھ کو پہاڑ بھی ڈاٹھا سکے اور جس کے دبدبے سے آسمان کا پتہ بھی پھٹ کر رہ گیا!

(۳۳) (اس کتاب کے بارے میں) جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں، حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہی شے ہے!

(۳۴) یہ ذات حق سبحانہ و تعالیٰ کا کلام ہے لہذا اسی کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی اور حقیقی جائسی بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی!

(۳۵) اس کی آیتوں میں سینکڑوں تازہ جہان آباد ہیں اور اس کے ایک ایک لمحے میں بے شمار

زمانے موجود ہیں!

(۳۶) (لیکن افسوس کہ اسے مسلمان!) تجھے اس کی آیات سے اب اس کے سوا اور کوئی سرکار

نہیں رہا کہ اس کی سورۃ لیلین کے ذریعے موت کو آسان کر لے!

(۳۷) ادنی لباس میں ملبوس اور اپنے حال میں مست صوفی قوال کے نغمے کی شراب ہی سے مدہوش ہے!

(۳۸) اس کے دل میں عرآقی کے کسی شعر سے تو آگ سی لگ جاتی ہے لیکن اس کی مٹھل میں قرآن کا کہیں گزر نہیں!

(۳۹) (دوسری طرف) واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ بھی خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باز دیتا ہے اور اس کے الفاظ بھی پر شکوہ اور بلند وبالا ہیں لیکن معنی کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے!

(۴۰) اس کی ساری گفتگو (بجائے قرآن کے) یا تو خلیب بغدادی سے اخذ ہوتی ہے یا امام دہلوی سے اور اس کا سارا سروکار بس ضعیف، شاذ اور مرسل حدیثوں سے رہ گیا ہے!

(۴۱) کوئی صاحب قرآن ہوا اور پھر بھی اس میں نہ جذبہ ہونہ حوصلہ و مانگ، کیتسی تعجب خیز اور

حیرت آمیز بات ہے!!

(۴۲) ہمارے سامنے ایک پڑانا اور گھسا پٹا عالم ہے اور ملت اسلامیہ اس کی خاک نشینی ہی میں آسودگی محسوس کر رہی ہے۔

(۴۳) مسلمان اقوام مثلاً مغلوب اور کردروں کے سینے حرارت سے کیوں خالی ہو گئے؟ آیا مسلمان پر موت طاری ہو گئی ہے یا خود قرآن ہی کے حیات بخش سوتے خشک ہو گئے ہیں!

(۴۴) (اے مسلمان!) تیری ذلت اور رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تو قرآن سے دور اور بے تعلق ہو گیا ہے لیکن تو اپنی اس زلوں حالی پر الزام گردش زمانہ کو دے رہا ہے!

(۴۵) اے وہ قوم کہ جو شہنشاہ کے اندر زمین پر پھری ہوئی ہے (اور پاؤں تلے روندی جا رہی ہے)

اٹھ کہ تیری بغل میں ایک کتاب زندہ موجود ہے! جس کے فدیے لے تو دوبارہ بام عروج پر پہنچ سکتی ہے!!

(۴۶) اے مسلمان! تیرا ایمان رسومات کے بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے اور تو خود کفر کے طور طریقوں کے زندان میں اسیر و قید ہے!

(۴۷) تو نے اپنی وحدتِ ملی کو پارہ پارہ کر لیا ہے اور اب ایک خوفناک انجام کی طرف تیزی سے رواں دواں ہے!

(۴۸) (اب) اگر تو دوبارہ مسلمان ہو کر جینے کا خواہش مند ہے تو (اچھی طرح جان لے کہ) اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنی حیاتِ نو کی بنیاد قرآن پر قائم کرے!

(۴۹) اس کتاب کا حقِ تلاوت تم ادا کرو۔ پھر جو مقصد و مطلب چاہو حاصل کر لو۔

(۵۰) (یہ کتاب حکیم) جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتی ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لیے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آ جاتی ہے!

(۵۱) بندہ مومن آیاتِ خداوندی میں سے ہے اور اس عالم کی حقیقت بس ایسی ہے جیسی اس کے لباس میں ایک قبا۔

(۵۲) جب اس کے لباس کی کوئی قبائلی کوئی عالم پرانا ہو جاتا ہے تو قرآن اسے ایک جہانِ نو عطا فرما دیتا ہے۔

(۵۳) عصرِ حاضر کو بھی بس ایک ایسا ہی جہانِ نو درکار ہے (جو قرآن سے ماخوذ اور مستنبط ہو!)۔

اے مسلمان اگر تیرے سینے میں ایک ایسا دل ہے جو معانی کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کر سکتا ہو تو (مجھ سے) یہ راز کی بات حاصل کر لے!

(۵۴) اے وہ شخص یا قوم جسے حاملِ قرآنِ عظیم ہونے پر فخر ہے، آخر کب تک جھروں اور گوشوں میں دبے رہو گے؟

(۵۵) (اُٹھو اور) دنیا میں دینِ حق کے اسرار و رموز کو عام کرو اور شریعتِ اسلامی کے دوز و حکم کی تشبیہ و اشاعت کے لیے سرگرم ہو جاؤ۔

(۵۶) شیطان کو بالکل ہلاک کر دنیا ایک نہایت مشکل کام ہے اس لیے کہ اس کا سیرِ نفسِ انسانی کی گہرائیوں میں ہے!

(۵۷) بہتر صورت یہ ہے کہ اسے قرآن حکیم کی (حکمت و ہدایت) کی شمشیر سے گھاتل کر کے مسلمان بنالیا جائے!

(۵۸) قرآن کے بغیر میری گیدڑ بن جاتا ہے اور اصل بادشاہی قرآن کے تعلیم کردہ فقریں ہے۔

(۵۹) جانتے ہو یہ قرآن کا فقر کیا ہے یہ ذکر اور فخر دونوں کے جمع ہونے سے وجود میں آتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ بغیر ذکر کے فخر کامل نہیں ہو سکتا۔

(۶۰) (لیکن یہ بھی جان لو کہ ذکر کی حقیقت کیا ہے) ذکر اصل میں ذوق و شوق کو صحیح راہ پر ڈالنے کا نام ہے۔ یہ محسوس زبان اور ہنٹوں کا وظیفہ نہیں بلکہ کامل وجود اور پوری ہستی کے ساتھ کرنے کا کام ہے۔

(۶۱) (اے مسلمان) اگر دوام و ثبات اور قوت و استحکام کا طالب ہے تو قرآن کے سامنے دست سوال دراز کر۔ اس لیے کہ مجھے قرآن ہی کے مخفی چشموں میں آپ حیات کا سراغ ملا ہے!

(۶۲) یہ ہمیں بے خوفی کا پیغام ہی نہیں دیتا، بالفعل اس مقام تک پہنچا بھی دیتا ہے جہاں خوف باقی رہتا ہے (نہ عزرا)!

(۶۳) میں نے قرآن کے بحرِ بیکراں کے موتی میندھ لیے ہیں اور ”صِبْغَةَ اللہ“ کے اسماء اور موزوں کی شرح بیان کر دی ہے۔

(۶۴) میرے فخر کی یہ بلندی اور گردوں نور دی سرا سر قرآن ہی کے فیض سے ہے اور اسی کے طفیل میرے خیالات میں بحرِ بیکراں کی سی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔

(۶۵) پس (اگر خدا توفیق دے تو) میری شراب کے ایک دو جام چڑھا لینی میرے فخر اور پیغام سے سرشار ہو کر آمادہ عمل ہو جا تا کہ تو شمشیرِ ربہند کے مانند چمکنے لگے!

(۶۶) وحدتِ آئین ہی مسلمان کی زندگی کا اصل راز ہے اور ملتِ اسلامی کے جذبہ ظاہری میں روحِ باطنی کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے۔

(۶۷) ہم تو سرتاپا خاک ہی خاک ہیں، ہمارا قلب زندہ اور ہماری روح تابندہ تو اصل میں قرآن ہی ہے!

(۶۸) (اے ملتِ اسلامی! اب بھی وقت ہے کہ تو اپنے آپ کو تویوں کی طرح قرآن کے شتے میں بٹیندہ اور پروے ورنہ پھر اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ خاک اور دھول کے مانند پریشان اور منتشر اور ذلیل و خوار رہے! * * *

ع بیابہ مجلس اقبال دیکھ دو ساغر کش!

فکرِ اقبال

کی روشنی میں

حالاتِ حاضرہ

ہماری قومی ذمہ داریاں

خطاب پہ مجلس اقبال

۲۱ اپریل ۱۹۸۶ء ————— انجمنِ ادیبوں

از

اسرار احمد

امیرِ تنظیم اسلامی و صدقہ منسوس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

احمدہ واصلی علیٰ رسولہ الکریم

اتباعہ فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ○ بسم اللہ الرحمن الرحیم
رب اشرح لی صدری ○ ویسری امری ○ واحلل عقدہ من لسانی ○
یفقہوا قولی ○

محترم و مکرم صدر مجلس!

محترم اراکین و کارکنان سرگزیدہ مجلس اقبال لاہور
اور معزز خواتین و حضرات!

اگرچہ اس سے قبل بھی متعدد بار ”بیاب مجلس اقبال و یک دوسا غرش“ کے مضائق
مجلس اقبال میں شرکت و شمولیت کی سعادت حاصل ہو چکی ہے لیکن اس بار جس انداز میں اس
بندۂ ناچیز کا اعزاز و اکرام فرمایا گیا ہے اُس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مناسب الفاظ واقعہً
میرے پاس موجود نہیں ہیں۔ لہذا مجبوراً ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم کے الفاظ مستعار لے
رہا ہوں کہ ”اک بندۂ عاصی کی—— اور اتنی مداخلتیں——!“

مجھے آج صبح ہی کی فلاٹ سے ”شام الہندی“ کے منتقل ہو کر گرام کے لیے کراچی
روانہ ہو جانا تھا لیکن مجلس اقبال میں شرکت کی سعادت کے لیے یہ ادنیٰ سا تردد تو ہرگز کوئی
قربانی نہیں کہ یہاں سے سیدھا ایئر پورٹ اور ایئر پورٹ سے سیدھا تاج محل ہوٹل کراچی
پہنچوں۔———— البتہ منتظنین مجلس کا یہ احسان عمر بھر یاد رہے گا کہ انہوں نے خاص طور

پر میری شمولیت کے لیے مجلس کا آغاز اپنے طے شدہ پروگرام سے ایک گھنٹہ پہلے کیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنی اس محرومی کا احساس بھی شدت سے ہے کہ آج سے ڈیڑھ سال قبل کی ایک مجلس کی طرح آج بھی مجھے اپنی گفتگو ختم کرتے ہی آدابِ مجلس کے خلاف فوراً روانہ ہو جانا ہو گا اور اس طرح میں اپنے سے بدرجہا اعلیٰ و افضل اصحابِ علم و فضل کے انکار و خیالات سے مستفید نہ ہو سکوں گا۔ بہر حال ”مَالَا يَدْرُكُ كَلَهُ لَا يُتْرَكُ كَلَهُ“ کے مصداق جو میسر آ گیا ہے غنیمت ہے!

بہت سے حضرات یقیناً اس پر حیران ہوں گے کہ ’میں اپنی روایت کے بحیرِ خلاف‘ آج اپنے خیالات تحریری صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام معمول سے ہٹ کر اس بار ’مجلس اقبال‘ کے لیے بھی ایک موضوع تجویز کر دیا گیا ہے یعنی ”فکر اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ اور ہماری قومی و ذمہ داریاں“ اور یہ موضوع اولاً تو خطیبانہ جوش سے زیادہ سنجیدہ غور و فکر کا متقاضی ہے۔ ثانیاً اس کا اندیشہ ہے کہ زبانی گفتگو کی روا روای میں اس کا کوئی اہم گوشہ تشنہ نہ جائے! پھر ایک خواہش یہ بھی ہے کہ یہ باتیں جلد از جلد وسیع پیمانے پر لوگوں کے سامنے لائی جائیں اور سن و عن شائع ہوں لہٰذا ”وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ“ کے مطابق ذہن و لسان کے مابین قلم کو خیالات کی شیرازہ بندی کے ذریعے کے طور پر استعمال کر رہا ہوں۔

عنوان میں اختیار کردہ ترتیب سے ذرا سا ہٹ کر میں پہلے ”حالاتِ حاضرہ“ کے ضمن میں اپنا مشاہدہ اور تجزیہ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں؛ آج ہر شخص یہ محسوس کر رہا ہے کہ ہم نے معمارِ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح مرحوم کے اس اندیشے کے عین مطابق جو ان کے اس تاریخی جملے میں سامنے آتا ہے کہ:-

"God has given us a golden opportunity to prove our worth as architects of a new nation and let it not be said that we didn't prove equal to the task".

اپنی نااہلی اور عدم قابلیت کا بھرپور ثبوت دیتے ہوئے اُن کے قائم کردہ پاکستان کو تواریج سے لگ بھگ ساڑھے چودہ سال قبل دو تخت کر لیا تھا۔۔۔۔۔ اب اندیشہ یہ ہے کہ ٹھکڑو مصوٰر پاکستان علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں جس پاکستان کا خواب

"An independent Muslim State at least in the North-West of India".

کی صورت میں دیکھا تھا کہیں ہم اُسے بھی اپنی نااہلیوں کی بھینٹ نہ چڑھا دیں! اور اس طرح بصرِ غیر پاک و ہند کی مسلم قوم کی نصف صدی سے زائد عرصہ پر پھیلی ہوئی مساعی جبطِ اعمال کے حسرتناک انجام سے دوچار نہ ہو جائیں!۔۔۔۔۔ اس لیے کہ ایک طرف "ع" خوشی گنگوہے بے زبانی ہے زبانِ میری! کے مصداقِ تاحال 'بے آئینی' ہی سرزمینِ پاکستان کا آئین ہے گویا قمری حساب سے اپنی قومی زندگی کے چالیس سال پورے کر چکنے کے باوجود (واضح رہے کہ آنے والے ماہِ رمضان مبارک کی تائیسویں کو یہ چالیس سال پورے ہو جائیں گے!) ہم سہ

"چل سالِ عمرِ عزیزتِ گزشت مزاج تو از حالِ طفلی ز گشت" کے مصداقِ سیاسی و دستوری اعتبار سے ہنوز 'نا بالغ' ہیں!۔۔۔۔۔ تو دوسری طرف صاف نظر آتا ہے کہ "ع" آہ! وہ تیرنیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف"۔۔۔۔۔ اور

سہ "چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک راہِ رُکے ساتھ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہِ رُکے ہیں!" کے مصداقِ اس قافذِ ملی کی کوئی منزلِ معین ہے ہی نہیں! اور یہ "ہجومِ مومنین" بے مقصدیت کے صحرائے تہہ میں بالکل اس شان سے بھٹک رہا ہے کہ

سہ کس طرف جاؤں! کہہ رکھیں کہے آوازِ دُور اے ہجومِ ناامیدی دل بہت گھبراتے ہے!

چنانچہ اغیار طغنے دے رہے ہیں اور پھبتیاں چست کر رہے ہیں، مبصرین اور

تجزیہ نگار انتشار (DISINTEGRATION) اور حصّے بخرے ہو جانے

(BALKANISATION) کی پیشین گوئیاں کر رہے ہیں اور دشمن گھات میں ہیں کہ کب آخری ضرب لگانے کا بہترین موقع ہاتھ آئے اور ع "خوش درخشید و لے شعلہ متعل بود" کے مصداق عصرِ حاضر کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ختم کر دیا جائے۔!

گویا، نظرِ بظاہر، یوں محسوس ہوتا ہے کہ

اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز جس نے اس کا نام رکھا تھا اچانک کاف و نون

پاکستان کی فضا پر متذکرہ بالا عمومی تشویش اور بد دلی و مایوسی کے جو بادل چھائے ہوئے ہیں ان کے درمیان سے جہانمک کروا قعات کی دنیا میں "حالاتِ حاضرہ" کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کا شاہدہ کیا جائے تو صورتِ حال کچھ یوں نظر آتی ہے کہ:

ایک جانب سیاچین گلشیر ہمارے ہاتھ سے جا چکا ہے، اور کشمیر کی کنٹرول لائن آئے دن کی بھارتی جارحیت سے خون آلود ہوتی رہتی ہے، پھر کشمیر کے علاوہ ہماری حساس ترین سرحد سے ملحق بھارتی پنجاب شدید خلفشار اور عدم استحکام کا شکار ہے اور اس کے ضمن میں کوئی دن نہیں جاتا جب بھارتی زعمائیں سے کوئی نہ کوئی ہمیں مورد الزام نہ ٹھہراتا ہو نتیجہً پاکستان سے بھارت کی پیدا شدہ دشمنی اور استقل نفسیاتی اور واقعاتی آویزش پر سزا دیہ فوری اور شدید اندیشہ سرپرہیٹلارہا ہے کہ کسی بھی وقت اپنے اندرونی خلفشار کے باعث جھنجھلا کر بھارت کی بڑی جارحیت کا ارتکاب نہ کر گزرے!

دوسری جانب افغانستان کی صورتِ حال اور اس کے داخلی نظریاتی تصادم پر مستند اُدوس کی ننگی اور براہِ راست مداخلت اور امریکہ کی قدرے ڈھکی چھپی اور بالواسطہ دخل اندازی نے نہ صرف یہ کہ پاکستان کے لیے شدید مسائل اور خطرات پیدا کر رکھے ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان افغانستان اور بروسی ترکستان کے پورے علاقے کی قسمت کو گویا ایک معلق ترازو سے والبتہ کر دیا ہے۔ چنانچہ جہاں اس کی بھی اُمید ہے کہ ایک مردِ درویش کے لگ بھگ

پون صدی قبل کے الفاظ کہ

اک دلوں تازہ دیا میں نے دلوں کو لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند !

حقیقت و واقعیت کا روپ دھار لیں اور یہ خط ایک وحدت کی صورت اختیار کر کے اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور عالمی غلبے کا لفظ آغاز بن جائے، وہاں یہ خطرہ بھی حقیقی اور واقعی ہے کہ سائبریا کا برقانی رکھیجہ بحیرۂ عرب کے گرم پانی میں غوطہ لگانے کے لیے آخری دور کا آغاز کر دے اور خاکِ بدہن پاکستان بھی اُس کی عریاں جارحیت کا نشانہ بن جائے !

داخلی محاذ پر ————— پاکستان کی ماں اور معمار پاکستان اور مصور و مہکّر پاکستان دونوں کی مشترک وراثت مسلم لیگ جو ان دونوں کے منظرِ عام پر آنے سے قبل واقعہً صرف نوابوں اور نواب زادوں، اور وڈیروں اور جاگیرداروں کی جماعت تھی البتہ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۷۱ء کے درمیان ایک عوامی تحریک کی صورت اختیار کر گئی تھی عرصہ ہوا کہ ”بہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے“ کی مصداقِ کامل بن چکی ہے۔ اور حال ہی میں سرکاری و درباری ذرائع سے اُس کے تین مردہ میں جان ڈالنے کی جو کوشش ہوئی ہے اور غیر جماعتی انتخابات میں اپنے ذاتی وسائل اور محض زمینداری یا سرمایہ داری کے بل پر کامیاب ہونے والوں کی پیشانی پر اس کا لیل چسپاں کر کے اس کے نام سے فائدہ اٹھانے کی جو کوشش کی گئی ہے کون نہیں جانتا کہ اُس کا حاصل کچھ نہیں اور کم از کم عوام کی سطح پر اُس کی ذکوئی حقیقت ہے نہ حیثیت۔

اس طرح بظاہر موجود لیکن حقیقتاً کالعدم مسلم لیگ سے قطع نظر ————— قومی سیاست کے میدان میں انتہائی باتیں جانب ہیں وہ اشخاص اور گردہ جن کی پاکستان کو توڑ دینے کی خواہش اب ڈھکی چھپی نہیں رہی بلکہ بباغ و بیل سامنے آچکی ہے۔ ان میں شخصیات کی سطح پر تو اہم نام صرف خان عبدالغفار خاں اور جی ایم سید کے ہیں البتہ چھوٹی بڑی جماعتیں یا گردہ نصف درجن بلکہ اس سے بھی زائد ہیں جن میں اہم تر نام این ڈی پی، پی این پی، اور سندھی بوجی پنچتون متحدہ محاذ کے ہیں ! ————— تاہم غنیمت ہے کہ ابھی ان سب کا دائرہ اثر

صرف چھوٹے صوبوں تک محدود ہے اور پنجاب کی حد تک اس کی صرف ایک خفیف سی صدا بازگشت جناب حنیف رائے کی صورت میں سامنے آتی ہے!

دوسری انتہا پر ہیں بعض نیم مذہبی اور نیم سیاسی جماعتیں جن کی اکثریت واضح طور پر وائیں بازو سے تعلق رکھتی ہے۔ ان میں بھی قابل ذکر تو تین ہی ہیں یعنی جے یو آئی، جے یو پی اور جماعت اسلامی تاہم دوسری نسبتاً چھوٹی جماعتوں اور بڑی جماعتوں کے متحارب دھڑوں کو بھی شمار کیا جائے تو تقریباً وہی وائیں بازو والی تعداد بن جاتی ہے۔ یہ جماعتیں اگرچہ پاکستان کے بقا و استحکام کی بھی دل سے خواہش مند ہیں اور اس میں اسلام کے نفاذ کی بھی داعی ہیں لیکن اولاً اس بنا پر کہ ان کا دائرہ اثر بہت محدود بھی ہے اور ملک کے طول و عرض میں مختصر ٹکڑوں (SMALL POCKETS) کی صورت میں منتشر بھی، اور ثانیاً اس بنا پر کہ پاکستان اور اسلام دونوں کی محبت اور وفاداری کی عظیم قدر مشترک کے باوجود ان کی باہمی آویزش بلکہ جھپٹش ضرب المثل کی صورت اختیار کر گئی ہے، وہ کوئی فیصلہ کن کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں نظر نہیں آتیں!

ان دو انتہاؤں کے مابین واقعہ یہ ہے کہ قومی اور عوامی سیاست کا اصل دھارا سیکولر ڈیا کر لسی یا سوشل ڈیا کر لسی کے رخ پر بہہ رہا ہے جس میں یوں تو جماعتی اور تنظیمی سطح پر دو نام سامنے آتے ہیں یعنی ایک پاکستان پیپلز پارٹی کا اور دوسرا تحریک استقلال کا۔ لیکن بنظر غائر دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ عظیم دھارا اصلاً کچھ چھوٹی اور بڑی، اور نئی اور پرانی شخصیتوں اور ان کے مذاہن اور حامیوں، اور عاشقوں اور جان نثاروں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی سر توڑ کوششوں میں مصروف ہیں اور سر دست یہ کہنا مشکل ہے کہ اس عظیم لہر پر سواری کی سعادت کس کے حصے میں آتی ہے۔ گویا دیکھیے! اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا گنبد نیلوفری رنگ بدست ہے کیا!

اسی درمیانی دھارے میں ایک طوفانی لہر حال ہی میں آنے لے نظیر بھٹو کی اپنی اختیاری جلاوطنی کو ختم کر کے پاکستان واپسی۔۔۔۔۔ اور شہر اقبال لاہور میں ورود۔

اور اس موقع پر ان کے بے مثال اور حد درجہ والہانہ استقبال، اور پھر پاکستان کے دل پنجاب، اور اس کے بھی اصل قلب یعنی لاہور کو جبراً نوالہ، شیخوپورہ اور فیصل آباد وغیرہ کے اضلاع میں اُن کے شاندار اور والہانہ خیر مقدم اور عظیم اِشان جلسوں اور جلوسوں کی صورت میں اُٹھی ہے جس نے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے کسی بھی درجہ میں بہرہ ور ہر پاکستانی مسلمان کو نہ صرف یہ کہ درطہ حیرت میں ڈال دیا ہے بلکہ ملک و ملت کے مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے اور غور کرنے پر مجبور کر دیا ہے اور غالباً یہ بھی اسی کا شاخسانہ ہے کہ مجلس اقبال، بھی جو ایک خالص روایتی اور ثقافتی ادارہ بن چکی تھی ”فکر اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ اور ہماری قومی ذمہ داریوں کا جائزہ لینے پر مجبور ہو گئی ہے۔“

ہماری قومی اور عوامی سیاست کے اصل اور عظیم تر درمیانی دھارے میں جو طوفانی لہر حال ہی میں اُٹھی ہے اُس کے ضمن میں یہ بات بھی بالکل غلط نہیں ہے کہ یہ کسی حد تک آٹھ نو سال کے سیاسی جس کا ردِ عمل ہے اور اس بات میں بھی یقیناً کچھ نہ کچھ صداقت موجود ہے کہ حالیہ طوفانی کیفیت زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکتی، گویا ”چڑھی ہے یہ آندھی اتر جائے گی!“ — لیکن اس قسم کے جملہ عوامل کا حصّہ منہا کرنے کے بعد بھی اس کیفیت (PHENOMENON) کی اہمیت ہرگز کم نہیں ہوتی اور اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اس کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے کہ اس کے اصل عوامل کیا ہیں، اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور اس کے ضمن میں ملک و ملت کے مخلصوں اور یہی خواہوں کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے۔ — اس لیے کہ جہاں یہ اندیشہ موجود ہے کہ اس طوفانی لہر کے جوش کو ٹھنڈا پڑتے دیکھ کر اس پر سوار قائدین بے قابو ہو جائیں اور جھنجھلاہٹ میں کوئی غلط اقدام کر بیٹھیں، وہاں اس کے سرکاری یا غیر سرکاری مخالفین کا غلط طرزِ عمل اور MIS-HANDLING بھی نہایت خوفناک نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ جس کا ایک تجربہ ہم پندرہ سال قبل مشرقی پاکستان کے معاملے میں کر چکے ہیں!

میں جب علامہ اقبال کے فکر کی روشنی میں عوامی سیاست کے اس دریائی دھارے اور اس کی موجودہ طوفانی لہر کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے بعینہ وہی صورت نظر آتی ہے جو حضرت علامہ نے اُس تہذیبِ حاضر کے تجزیے کے ضمن میں پیش فرمائی ہے جو اپنے آغاز کے اعتبار سے تو یقیناً مغربی اور یورپی تھی لیکن اپنے اثر و نفوذ کے اعتبار سے دیکھتے ہی دیکھتے عالمی اور آفاقی بن گئی تھی اور اس وقت پورے کرۂ ارضی کو اپنی پلیٹ میں لیے ہوئے ہے — اور جس کی خودکشی کی خبر بھی علامہ مرحوم نے اب سے لگ بھگ پون صدی قبل دی تھی کہ —

دیارِ مغرب کے رہنے والوں خدا کی بستی دکاں نہیں ہے کھرجے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زہر کم مہل ہوگا
تہاری تہذیب اپنے نخر سے آپ ہی خودکشی کریگی جوشاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

اہل نظر جانتے ہیں کہ حضرت علامہ کے نزدیک اس تہذیب کے اہل اجزائے ترکیبی دو ہیں، ایک اس کی اہل ریڑھ کی ہڈی ہے جس کی صلابت اس کے قیام و بقا کی اہل اساس ہے، خطبات میں حضرت علامہ نے اسے 'INNER CORE' سے تعبیر فرمایا ہے —

اِنَّ اِسے خالص قرآنی الاصل گویا صد فی صد اسلامی قرار دیا ہے۔ یعنی الفاظِ قرآنی: "وَلَا تَقْفُ مَا لِكَيْسَ لَكَ بِهِمْ عِلْمٌ ط إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلٌّ أُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولَةٌ" (بنی اسرائیل: ۳۶) کے مطابق یہ طرز اور روش کہ اپنے موقف کی بنیاد نہ تو ہمت پر قائم کی جائے نہ زبرے ہوئی تختیلات پر بلکہ مشاہدات و تجربات اور ان پر مبنی ٹھوس استدلال پر قائم کی جائے۔ حضرت علامہ کی یہ رائے نہایت صائب اور حد درجہ اہم ہے اس لیے کہ واقعہ یہی ہے کہ یہی قرآنی ہدایت و رہنمائی تھی جس نے ایک جانب مظاہر قدرت کو آیاتِ الہیہ کا تقدس عطا فرمایا اور انسان کو کتابِ فطرت کے سائنٹیفک مطالعے اور مشاہدے کی جانب متوجہ کیا اور دوسری جانب منطق کو استخراج کی تکنیکیوں سے نکال کر

استقرار کی وسعتوں اور پہنائیوں سے روشناس کرایا — اور اس طرح جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے میدان ہموار کیا۔ چنانچہ یہی چیز یورپ میں تحریک احیاء علوم کی بنیاد بنی جس کے نتیجے میں یورپی اقوام اوجِ ثریا پر پہنچیں اور یہ صورت پیدا ہوئی کہ :

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سب سے جاتے ہیں کہیڑٹٹا ہوا تار اس پر کامل زمین جاتے
حضرت علامہ کی یہ زرف نگاہی بجائے خود جس عظمت کی مظہر ہے اُس سے قطع نظر
میرے لیے اس کی قدر و قیمت کا ایک اضافی پہلو یہ ہے کہ اس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اہم قول کی عظمت و صداقت مبرہن ہوتی ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ ”ان الله يرفع بهذا الكتاب اقواما ويضع به الآخرين“ ”اب اللہ تعالیٰ اسی کتاب (قرآن) کے ذریعے قوموں کو اُبھارے گا اور اسی کے (ترک کرنے کے) باعث قوموں کو گرائے گا“ گویا مغربی تہذیب بھی جو اُبھری تو یقیناً قرآن ہی کی ہدایت و رہنمائی کے ایک اہم جزو کے سہارے اُبھری ! اور مسلمان گرے تو اسی سبب سے گرے کہ انہوں نے قرآن کی اس ہدایت سے یورپ کو روشناس کرنے کے بعد خود اسے ترک کر دیا گویا —

وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر اور تم غدار ہوئے تارکِ مشرآں ہو کر
اور خوار از مہجرتِ مشرآں شدی شکوہ سچ گردشِ دوراں شدی
اے ہوں شبہم برزیں افتندہ در بغل داری کتاب زندہ

۲۔ تہذیبِ حاضر کا دوسرا جزو اس کے کچھ خارجی مظاہر ہیں جنہیں خطبات میں تو حضرت علامہؒ نے صرف ایک لفظ ’DAZZLING EXTERIOR‘ سے تعبیر فرمایا ہے لیکن اشعارِ اقبال کے قلم سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مظاہرِ خارجی کے بھی دوسرے ہیں جنہیں کہیں تو حضرت علامہؒ چہرہ روشن اندرون چینگیز سے تاریک تر کے الفاظ سے تعبیر فرماتے ہیں کہیں ان کی نشاندہی ’مطبِ مغرب کے مرنے بیٹھے اثرِ خوابِ آدری‘ جیسے الفاظ کے ذریعے کرتے ہیں — اور اس ضمن میں غالباً سب سے زیادہ بھرپور انداز یہ ہے کہ —

نظر کو خیر کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی یہ صنایع مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
 تہذیبِ حاضر کے ان بظاہر حسین و غشنا اور دل کش و مرعوب کن مظاہر خارجی میں
 سے مثلاً ایک حریتِ نکر ہے جس کے پردے میں یا باضابطہ کفر و الحاد ہے یا لادریت و ارتیابیت
 اور ان دونوں کا حاصل ہے یا عرباں لاندہ بیت یا کم از کم محدود مذہبیت کے پردے میں لپٹی
 ہوئی لادنییت! — گویا سہ

ہو نکر اگر خام تو آزادیِ افکار انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ !
 دوسرے حریتِ عمل ہے جس کی شکست والی تہ کے نیچے مضمر ہے اباحت اور آوارگی کا زہر
 جس نے اخلاق و کردار اور شرافت و انسانیت کا دیوالہ نکال دیا ہے، تیسرے نمبر پر ہے
 حریتِ نسواں اور نظریہ مساوات مرد و زن جس نے مرد کو 'نامرد' اور زن کو 'نازن' بنا کر رکھ
 دیا اور دونوں کو تماشائی و ہرجائی بنا کر خاندان کے مقدس ادارے کی چولیس ہلا کر رکھ دیں۔
 نتیجہ یہ نکلا کہ سہ

فساد کا بے فرنگی معاشرت میں ظہور کہ مرد سادہ ہے بے چارہ زن شناس نہیں
 اور کیا یہی ہے معاشرت کا کمال؟ مرد بے کار و زن تہی آغوش!
 اسی طرح سہ "خشیتِ اولِ جن نہد معارکج" تاثرات می رود دیوار کج!
 کے مصداق اجتماعیاتِ انسانیہ کے ضمن میں تہذیبِ مغرب نے سیاسی و معاشی مساوات
 کے حسین عنوانوں سے انسان کو اولاً لادینی جمہوریت (SECULAR DEMOCRACY) کا
 تحفہ دیا جو "چہرہ روشن اندروں چٹنگیز سے تاریک تر" کا مصداقِ کامل ہے۔ اس لیے کہ
 اس کے ذریعے حقیقتاً سرمایہ داروں کی بدترین آمریتِ عوام پر مسلط ہو گئی۔ سہ
 دیوِ استبدادِ جمہوری قبا میں پاتے کوب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

اور اس کے بعد اس نہیلے پر دہلا بے خدا اشتراکیت کا مار جس نے انسان سے اُس کی آزادی
 کو گھٹی سلب کر کے اُسے ایک مشین کا پرزہ بنا کر رکھ دیا۔ فاعستبروا

آگے بڑھنے سے قبل اس مقام پر دو امور کی وضاحت مناسب ہے:

ایک یہ کہ تہذیبِ جدید کے اس ایسے کا اہل سبب سورۃ البقرۃ کے چوتھے رکوع کی روشنی میں ایک جملے میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ اس نے ”عِلْمَ الْأَسْمَاءِ“ پر تو پوری توجہ صرف کی جو ابتدائے آفرینش ہی میں حضرت آدم کی سرشت میں ودیعت کر دیا گیا تھا اور جس نے تاریخِ انسانی کے دوران مسلسل بروز و ظہور اور صعود و ارتقار کے ذریعے ”عِلْمَ الْأَشْيَاءِ“ اور ”عِلْمِ الْخَوَاصِّ“ کے راستے سے سانس اور ٹیکنالوجی کی صورت اختیار کی۔ لیکن اس علمِ وحی سے یکسر منہ موڑ لیا جسے قرآن ہدایت (فَأَمَّا يَا بَنِيَّ كُفُّوا عَنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَاى فَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ) سے تعبیر کرتا ہے۔ نتیجہً اُس نے اُس دُجال کی صورت اختیار کر لی جس کی ایک آنکھ بند ہے اور جس کی پیشانی پر جلی صروف میں ”ک ف ر“ لکھا ہوا ہے چنانچہ اب یہ یک چشمِ عُصْرَتِ نَوْعِ انسانی ہی نہیں ہر قسم کی حیاتِ ارضی کی کلی تباہی پر تلا کھڑا ہے!

دوسرے یہ کہ عالمِ اسلام میں اس تہذیب کے ضمن میں یہ متوازن نقطہ نظر میری محدود معلومات کی حد تک سوائے علامہ اقبال مرحوم کے اور کسی کے یہاں نظر نہیں آتا، اور اُن کے بعد اُن کی شمع سے اپنے چراغ روشن کرنے والوں میں بھی کم از کم اپنی محدود بصارت و بصیرت کی حد تک مجھے صرف ایک شخصیت ایسی نظر آتی ہے جس کے فکریں اس توازن کا عکسِ کامل موجود ہے اور وہ ہیں ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم و مغفور! — درنہ اکثر و بیشتر افراد و اشخاص کی حد تک بھی یا حیرانی و سرگردانی نظر آتی ہے یا انتہا پسندی اور یک رخا پن! — اور بحیثیتِ مجموعی بھی ملت کے دو اہم طبقات نے متضاد طرزِ عمل اختیار کیا۔ چنانچہ ایک طرف علماء کرام کی اکثریت نے اس تہذیب کو بالکل رد کر دیا۔ نتیجہً اس کے اُکسن سے بھی محرومی اختیار کر لی جو اصلاً خالص قرآنی اور اسلامی تھا۔ اور وہ صرف

آسمانی ہدایت کے ذہن بن کر قال اللہ اور قال الرسول کے صدار میں محصور ہو کر رہ گئے۔ اور دوسری جانب قوم کی عظیم اکثریت نے تہذیب مغرب کو بن و بن قبول کر لیا۔ نتیجہً اس کے 'INNER CORE' کے ساتھ ساتھ اس کی جھوٹے نگوں کی رینہ کاری سے پیدا شدہ صنائی کو بھی ایک شکست غور وہ اور مرعوب ذہنیت کے ساتھ جوں کا توں قبول کر لیا۔ نتیجہً نکلا جسے کسی صاحبِ ورد نے یوں بیان کیا کہ۔

میں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں الجھ کر اکثر تم نے اسلاف کی عزت کے کفن بیچ دیئے

نئی تہذیب کی بے حد بہاروں کے عوض اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیئے

اور اس ضمن میں بھی اللہ رحمتیں نازل فرمائے اپنے اُس بندہ قلندر پر جس نے کمال انصاف کا ثبوت دیا جب ملت کے ان دو اہم طبقات کے تضاد عمل کو یوں واضح کیا کہ۔

کہا اقبال نے شیخ حرم سے تہ محراب مسجد سو گیا کون؟

نذا مسجد کی دیواروں سے آئی فرنگی بنگلے میں کھو گیا کون؟

مگر اقبال کی اس روشنی میں پاکستان کی عوامی سیاست کے بڑے اور درمیانی دھارے اور اُس کی حالیہ مہیب لہر کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے بھی دو جزو سامنے آتے ہیں چنانچہ اس کا بھی ایک 'INNER CORE' ہے جو نہ غیر اسلامی ہے نہ غیر قرآنی، اور نہ افکار و نظریات اقبال کے منافی ہے، نہ تصورات قائد اعظم کی نقیض بلکہ عین قرآنی اور اسلامی بھی ہے اور پاکستان کے مصور و مفکر اور مؤسس و مہمار دونوں کے خیالات کے مطابق بھی اور اسی میں اس دھارے کی مقبولیت اور اس کی قوت و شوکت کا راز مضمر ہے، البتہ دوسرا جزو جو بجائے خود نہایت اہم ہے بے خدا بھی ہے اور بے دین بھی اور خالص مُشرکانہ بھی ہے اور ملحوظ بھی! اور یہ بات نہایت اہم اور لازمی ہے کہ ان دونوں اجزاء کو علیحدہ علیحدہ پہچان لیا جائے اور دونوں کے ساتھ ایک طرز عمل اختیار کرنے کی بجائے علیحدہ علیحدہ رویہ اختیار کیا جائے!

اس دھارے اور لہر کی 'INNER CORE' کے اجزاء ترکیبی میں سے اولین

جزو ہے۔ "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ... الْآلِیَہ" کے مطابق انسان کا محض انسان ہونے کے ناطے اعزاز و اکرام اور تشریف و محکرم، اور رنگ و نسل، مال و منال، اور عہدے، پیشے یا جنس کی بنیاد پر انسانوں کے مابین اعلیٰ و ادنیٰ، شریف و ذلیل، اور اونچ اور نیچ کے جہل امتیازات کا مکمل خاتمہ اور انسانوں کے مابین اس سماجی و معاشرتی سطح پر کامل مساوات! انجوائے الفاظ قرآنی: "يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتَقْوَىٰ" (الحجرات ۱۳) اور بقول اقبال

کُلُّ مومن اخوة، اندر دیش حریت سرمایہ آب و گلش

ناشکب امتیازات آمدہ! در نہاد اُد مساوات آمدہ!

ان امتیازات کا کُلّی خاتمہ اور کامل انسانی مساوات کا بالفعل قیام رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ طرہ امتیاز ہے جس کے سامنے اپنی جی و ملیز جیسے دشمن اسلام اور شاہ قلم رسول بھی اپنے آپ کو سر جھکانے پر مجبور پاتے ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے یہی وہ چیز ہے جو موجودہ نام نہاد ملان معاشرے میں ناپید ہو چکی ہے اس ضمن میں علامہ اقبال نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ "یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو، تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو! — میں اُن کی رُوح سے معذرت کے ساتھ اس میں یہ اضافہ کروں گا کہ "تم سبھی کچھ ہو مگر سوچو کہ انسان بھی ہو!"

اس 'INNER CORE' کا دوسرا اہم جزو ہے انسان کے بنیادی عمرانی حقوق

(یعنی — CIVIL RIGHTS) اور اُن کے ضمن میں کامل سیاسی و قانونی مساوات! جس سے "تمیز بند و آقا" کا مکمل خاتمہ ہو جائے اور نہ کوئی قوم کسی دوسری قوم پر چکرمان ہو، نہ کوئی طبقہ دوسرے طبقے پر برتری کا حامل ہو اور نہ ہی کوئی علاقہ دوسرے علاقے پر بالادستی کا حق جیتائے، بلکہ نوع انسانی "کونوا عباد اللہ اخواناً" (الحديث) پر عمل پیرا ہو جائے۔

(ترجمہ) تم سب اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ! — حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات اقدس اور جسم اطہر کو بھی قصاص کے لیے پیش فرما کر حضرت

عمرؓ نے مجھے جمع میں احتساب پر رافز و ختم نہ ہو کر بلکہ بالفعل جوابدہی فرما کر اور حضرت علیؓ نے اپنے عہد خلافت میں عدالت میں ایک عام مدعی کی حیثیت سے پیش ہو کر اور اپنے دعوے کے اخراج پر کبیدہ خاطر نہ ہو کر جو اعلیٰ درویش اور ابدی ولا زوال مثالیں قائم کی تھیں وہ آج متفق علیہ اقدار کی حیثیت سے انسان کے اجتماعی ضمیر کا جزو لاینفک بن چکی ہیں اور عہد حاضر کا انسان ان کو **ACHIEVE** اور **REALISE** کرنے کے لیے علامہ اقبال کے ان پر سکھو الفاظ کے مطابق ہاتھ پاؤں مار رہا ہے کہ

ہر کجاہی سنی جہان رنگ و بو زانچہ از خاکش بروید آر زو!

یا ز نور مصطفیٰ او را بہاست یا ہنزد اندر تلاش مصطفیٰ است!

لیکن چونکہ وہ نور نبوت سے براہ راست استفادہ کرنے پر آمادہ نہیں لہذا افرط و تفریط کے دھکوں کے سوا اسے کچھ حاصل نہیں ہو رہا۔ تاہم کون نہیں جانتا کہ آج ان اقدارِ عالیہ سے سب سے بڑھ کر محروم اور سب سے زیادہ تہی دست و تہی دامن وہ ہیں جو مسلمان کہلاتے ہیں۔ اور اسی کا ردِ عمل ہے جو ہماری سیاست کے موجودہ ابھار کی اساس بنا ہے!

اس 'INNER CORE' کا تیسرا لیکن اہم ترین جزو ہے معاشی عدل و انصاف اور کم از کم مواقع کی حد تک کابل مساوات اور ہر نوع کے اقتصادی استحصال اور سرمایہ داری کی لعنت کا مکمل خاتمہ اور ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت کا ذمہ! یہ تمام باتیں وہ ہیں جو تمام جہانوں کے پروردگار نے اپنے کلام پاک میں ارشاد فرمائیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے حواریین و خلفاء راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے بالفعل کر کے دکھائیں چنانچہ "كَيْلًا يَكُونُ دَوْلَةُ بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ" کے مطابق دولت کی منصفانہ تقسیم اسلام کے معاشی نظام کا اصل الاصول ہے اور "وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا لِي" اللہ رزق تھا" کے مطابق حضرت عمرؓ کا یہ قول کہ: اگر جلد و فرات کے کنارے کوئی گنا

بھی بھوکا مر جائے تو اس کے لیے اللہ کے یہاں عمرِ دُردار ہوگا! اسلام کے اقتصادی مقاصد کے ضمن میں POLICY STATEMENT کی حیثیت رکھتا ہے جسے اقبال نے یوں تعبیر فرمایا کہ:

ۛ کس نباشد در جہان محتاج کس نقطہ شروع ہمیں اس است و بس

اور آب و نان ماست از یک مادہ دُردہ آدمؑ کفّیں واحدہ

لیکن افسوس کہ جب مسلمانوں کے دُورِ زوال میں اس پر ملکیت کے ساتھ ساتھ جاگیر داری اور سرمایہ داری کی چھاپ پڑ گئی تو اسلام اور قرآن کے رُخِ روشن کی یہ جہاں تابیاں نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں وہ صورت بن گئی جس کا نقشہ حضرت علامہ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ

جاننا ہوں میں یہ اُمتِ حاملِ مَستراں نہیں ہے وہی سرمایہ داری بندہ مومن کا دین

جاننا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں بے یار بیٹھا ہے پیرِ مہمانِ حرم کی آئینا

نتیجہ — قوم کی عظیم اکثریت تو اقبال کے اس شعر کا مصداقِ کامل بن ہی چکی ہے کہ

بِیچِ خیر از مردِ زکّش مَجُو لَبَنَ تَنَالُوْا لَیْرَحَتْیْ تُنْفِقُوْا

خود مذہبیت کی بھی اکثر و بیشتر صرف یہ مسخ شدہ صورت (PERVERTED FORM) باقی رہ گئی ہے کہ ہر قسم کے حرام و حلال ذرائع سے دولت سمیٹو البتہ کچھ صدقہ و خیرات کے کھاتے بھی جاری رکھو۔ چنانچہ حکومت کی جانب سے سود دے کر اُس میں سے زکوٰۃ وصول کر لینے کا تماشا تو حال ہی میں ہوا ہے۔ 'سود لو اور اُس میں سے زکوٰۃ دے دو' پر تو ہمارے مذہبی مزاج کے سرمایہ دار بزرگ بہت پہلے سے عمل پیرا ہیں۔

اس سلسلے میں نقد کے ضمن میں 'ربا البنیہ' اور 'ربا الفضل' کی جو بے شمار صورتیں سرکاری و غیر سرکاری سطح پر ہماری پودھی تجارت و صنعت اور ریاست کی سطح پر دفاع و ترقی کی جھبکیوں میں رچی بسی ہوئی ہیں اُن کا ذکر تو تحصیل حاصل ہے، اگرچہ حضرت علامہ کے یہ دو اشعار نقل کیے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا کہ

از ربا آسند چہ می زاید فتن! کس نداند لذتِ قرضِ حسن

از باباں تیرہ، دل چوں نشت و سنگ . آدی دندہ بے دندان و چنگ
 تاہم زمین کے سود کا ذکر ضروری ہے۔ اس لیے کہ اُس کے ضمن میں مذہبی سطح پر تو مغالطے
 موجود ہیں ہی شہید ایان اقبال کا ذہن بھی صاف نہیں ہے چنانچہ وہ ان اشعار کو تو لہک
 لہک کر پڑھتے ہیں کہ:

کرتبہ دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف منعموں کو مال و دولت کا بنانا ہے اس
 اس سے بڑھ کر اڈا، فخر و عمل کا انقلاب بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمین
 اور۔ وہ خدایا یہ زمین تیری نہیں تیری نہیں تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں
 اور۔ رزق خود را از زمین بدمن روا بست اس مستراح بندہ و ملک خدا است!
 لیکن غالباً انہوں نے قرآن کی اس تعلیم اور اقبال کی اس تبیین کو صرف اخلاقی و عظمیٰ کے خانے
 میں رکھا ہوا ہے اور یہ نہیں جانتے کہ زمین کے سلسلے میں یہ اسلام کے قانونی و فقہی نظام
 کی اہم اساس ہے! چنانچہ امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام دارالہجرت مالکؒ دونوں کا متفقہ فتویٰ
 ہے کہ مزارعت مطلقاً حرام ہے اور اقبال کا یہ فرمانا محض شاعری نہیں ہے کہ

خدا آن فتنے را سروری داد کہ تقدیرش بدست خویش بنوشت
 بہ آن قوسے سرور کارے ندارد کہ دہقانں برائے دیگران کشت

چنانچہ سماجی، سیاسی اور معاشی جملہ سطحوں پر تمام نا انصافیوں اور ناہمواریوں کا
 خاتمہ کر کے دین حق کے کامل نظام عدل و قسط کو بالفعل نافذ و قائم کرنے کے لیے
 مبعوث فرماتے گئے تھے خاتم النبیین اور سید المرسلین، محمد الامین صلی اللہ علیہ وآلہ
 وسلم! ————— (بقوائے الفاظ قرآنی "وَأُمِرْتُ لِأَعْبِدَ بَيْنَكُمُ" (الشوری: ۱۵) اور
 "لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ" (الحج: ۲۵) اور "خَدَايَا آن کرم بارہ دگر کن" کے مصداق

اسی کا پیغام دیا تھا حکیم الامت اور مصوٰر پاکستان علامہ اقبال مرحوم نے کہ

بمصلّٰی برساں خویش را کہ دیں ہر دوست اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است !

چنانچہ اقبال سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ جہاں شعریت اور جذباتی سوز و ساز کے اعتبار سے کلام اقبال کے نقطہ عروج کا مظہر اُن کی دوسری نظمیں (خصوصاً ذوق و شوقِ ہمیں اُل امتِ مسلمہ کے نام اُن کے پیغام کا مظہر اتم و اکمل ہے) اُطیس کی مجلس شوریٰ اور خصوصاً اُس کے یہ آخری اشعار:۔

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف ہونہ جائے آشکارا شدہ پیغمبر کہیں!

الحذر! آئینِ پیغمبر سے سوارِ الحذر حافظِ ناموسِ زن، مردِ آزا، مردِ افسیر

کہتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف معنوں کو مال و دولت کا بنانا ہے ایس

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب پادشاہوں کی نہیں! اللہ کی ہے یہ زیں

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب یہ قیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقین!

چنانچہ اُس مردِ قلندر نے تو نہ صرف یہ کہ ”جو ہر دریائے قرآنِ مسّٰفہ ام“ کے مصداق قرآنِ حکیم کے حقائق و معارف کی دل نشیں پیڑائے اور شعری اسلوب میں تعبیر و تعلیم میں اپنی توانائیاں کھپا دیں بلکہ ساتھ ہی ”انقلاب“ کا نعرو بھی بلند کر دیا تھا کہ

خواجہ از خونِ رگِ مزدور ساند لعلِ ناب از جھلّے دہ خلیاں کشت دہقانِ خراب

انقلاب! انقلاب! لے انقلاب!!!

یہ دوسری بات ہے کہ اُن کے نام لیواؤں اور شیدائیوں نے اُن کے ساتھ وہ معاملہ کیا کہ

ہر کے از ظنِ غم شد یارِ من در دروین من نہ جُست اُسرا برین

مزید برآں — یہی مٹی وہ حقیقت جسے تعبیر فرمایا تھا بابائے قومِ اہلبانی پاکستان

قائدِ اعظم محمد علی جناح نے کبھی ان الفاظ سے کہ ”ہم پاکستان کی صورت میں ایک ایسے خطہ

ارضی کے خواہاں ہیں جس میں اسلام کے اصولِ حریت و اخوت و مساوات کا عہدِ حاضر میں

عملی اور شمالی نمونہ پیش کر سکیں۔ اور کبھی یہ فرما کر کہ ”اسلام ایک سوشل ڈیا کریسی ہے!“

(روایات بالمعنی!)

لیکن افسوس کہ علامہ اقبال تو خالص ’منون عمر‘ میں پاکستان کے قیام سے لگ بھگ دس سال قبل ہی دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، قائد اعظم مرحوم بھی قیام پاکستان کے بعد کل ایک سال زندہ رہے۔ اور اُن کے بعد اُن کی عوامی تحریک کا ثرہ اُچک لیا، اولاً نوابوں اور لوہاروں اور زمینداروں، جاگیرداروں اور وڈیروں نے، اور بعد ازاں اس میں مستقل حصہ دار تو بن گئے کچھ نئے اور پرانے سرمایہ دار اور باری باری حصہ بٹاتے رہے اعلیٰ رسول اور فوجی عہدہ دار جس کے نتیجے میں قانون قدرت کے عین مطابق عوامی سطح پر ایک شدید احساس محرومی پیدا ہوا جو اندر ہی اندر سلگنے والی آگ کے مانند بڑھتا چلا گیا۔ اور اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ اسی احساس محرومی کی پُر زور ترجمانی کی تھی، ذوالفقار علی بھٹو نے جس نے پاکستان کی سیاست کے اُس نئے اور زوردار عوامی دھارے کو جنم دیا تھا جس کی ایک طوفانی لہر پر سوار ہو کر وہ اب سے پندرہ سال قبل خود ایوان اقتدار تک پہنچے تھے!

واضح رہے کہ اس وقت مجھے نہ بھٹو صاحب کی ذات اور شخصیت سے کوئی بحث ہے نہ اُن کی سیرت و کردار سے، اور نہ اُن کے خلوص یا عدم اخلاص کے بارے میں کوئی گفتگو کرنی ہے، نہ اُن کی اہلیت یا نا اہلیت کے بارے میں کوئی فیصلہ دینا ہے بلکہ فی الوقت میری گفتگو صرف اور صرف پاکستان کی عوامی سیاست کے درمیانی دھارے کے اُس ’INNER CORE‘ کی تعین و تشخیص سے متعلق ہے جس نے اس میں وہ قوت و مقامت پیدا کر دی ہے کہ پاکستان کی تاریخ کے طویل ترین مارشل لائے بھی اُس کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آتی۔ چنانچہ مارشل لاء کے ذرائع منظر میں جاتے ہی اُس کی طوفانی لہر سامنے آگئی۔ اگرچہ یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ اس بار اس پر سواری بھٹو مرحوم کی صاحبزادی

میں بے نظیر کرتی ہیں یا ان کے سابق رفیقِ کار مسٹر جتوئی، یا ان کی ایک نظر بندی کے دوران ان کے خلاق کوپڑ کرنے والے ایر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان — یا کوئی اور !!

بہر حال یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ اس دھارے کے بہاؤ کو روکنا نہ کسی چوتھے مارشل لار کے لیے ممکن ہے نہ پانچویں کے اور اس کے آگے نہ علاء کرام کوئی بند باندھ سکتے ہیں نہ شاخِ عظام نہ پشتینی رئیس اس کی راہ میں مزاحم ہو سکتے ہیں نہ ٹو دو لیتے سرمایہ دار، نہ سردار اور وڈیرے اس کا راستہ روک سکتے ہیں نہ زمیندار و جاگیردار — اور نہ کوئی میر اس کے راستے میں حائل ہو سکتا ہے نہ کوئی پیر — زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کیا جاسکتا ہے تو صرف یہ کہ اس کے رُخ کو موڑنے کی کوشش کی جائے !

اس لیے کہ مغرب کی اندھی تقلید میں ہمارا یہ ڈان بھی خالص مادیت ہی کے رُخ پر بہہ رہا ہے اور اس کے 'INNER CORE' کا سارا خارجی لبادہ یورپ سے مستعار لیا ہوا ہے۔ چنانچہ اس کا کوئی براہِ راست سروکار نہ اللہ سے ہے نہ رسولؐ سے اور اس میں نہ ہدایتِ آسمانی سے کوئی اعتناء ہے نہ آخرت کی جوابدہی کا کوئی ذکر، لہذا عدلِ اجتماعی کے جملہ تصورات و معیارات بھی مغرب ہی سے ماخوذ ہیں اور ان کے ضمن میں افراط و تفریط کی انتہاؤں کے مابین بٹھکنے کی کیفیت بھی لامحالہ وہیں کا چرہ ہے — مزید برآں ان

کے جلو میں بے پردگی بھی ہے اور عریانی بھی، اباحت (PERMISSIVENESS) بھی ہے اور آوارگی بھی، لاف زنی بھی ہے اور بڑکیں بھی، بھنگ ٹھہ بھی ہے اور "ہے جہا لو" بھی — اور ان سے بھی بڑھ کر عبادات سے بے اعتنائی ہی نہیں، ان کا استہزاء و خرخہ شریعت سے بے پردہا ہی ہی نہیں اس کے خلاف نشوز اور بغاوت ہے اور شعائرِ اسلامی کا عدم احترام ہی نہیں ان کی باضابطہ توہین و تذلیل ہے — و قس علی ذلک !

فکرِ اقبال کی روشنی میں اس صورتِ حال کا علاج بھی اس کی نکلی منفی

(TOTAL REJECTION) اور یکثیت مجموعی رد کر دینے

میں نہیں بلکہ اس کے صحیح جز کو قبول کرتے ہوئے غلط جز کی اصلاح میں مضمر ہے!
بالکل ایسے جیسے حضرت علامہ نے موجودہ سائنس اور ٹیکنالوجی کو ایک ایسے نیام سے
تشبیہ دی ہے جس میں سے ایمان باللہ کی تلوار نکال لی گئی ہو۔

عشق کی تیج جگر دار اڑالی کس نے؟ علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!
گو یا نیام تو اپنی جگہ درست اور کارآمد ہے، ضرورت صرف اس کی ہے کہ اس میں تلوار داخل کی
جائے اسی طرح علم جدید میں فی نفسہ کوئی شے غلط نہیں ہے اور کائنات کے بارے میں
معلومات کا جو عظیم خزانہ اس نے جمع کیا ہے وہ اپنی جگہ متاع بے بہا ہے۔ ضرورت صرف
اس امر کی ہے کہ اس میں خالق کائنات کی معرفت و محبت کی چاشنی گھول دی جائے!
یہی وجہ ہے کہ حضرت علامہ نے اپنے اُس مشہور اور متنازعہ فارمولے میں کہ:

“MARXISM + GOD = ISLAM”

مغرب کے آدمی فکر کی منطقی انتہا یعنی جدلی مادیت اور اس کے بھی نقطہ عروج یعنی مارکسزم
تک کو بالکلیہ رد نہیں کیا بلکہ صرف اس ضرورت کا احساس دلایا ہے کہ اس میں ایمان باللہ کا
تربیاتی شامل کر دیا جائے تو اس کی بنیاد اور زہر ناک ختم ہو جائے گی اور یہ اسلام کے بہت
قریب آجائے گا!

بنابریں ہوا اقبال کی روشنی میں اس وقت کرنے کا اہل کام یہ ہے کہ پاکستان
کی عوامی سیاست کے عظیم دھارے کے آگے بند باندھنے کی لا حاصل ہی نہیں حد درجہ مضمر
اور خطرناک کوشش کی بجائے اس میں ایمان و یقین کی چاشنی اور حکمت و معرفت کی روشنی
شامل کرنے کی کوشش کی جائے اور اس طرح فی الجملہ اس کے رخ کو آسمانی ہدایت کی
جانب موڑ دیا جائے!

اور یہ کام، ظاہر ہے کہ ہرگز آسان نہیں بلکہ نہایت مشکل اور مشقت طلب ہے، اہستہ

اس کے ضمن میں ایک بہت اہم اور موثر کردار ادا کر سکتے ہیں وہ لوگ جو اقبال کے مداح و شیعانی اور اُن کے فکر و فلسفہ اور حکمت و بصیرت سے فیض حاصل کرنے والے اور خود کو اُن کی جانب منسوب کرنے والے ہیں۔ اس لیے کہ اقبال کے تذکرہ بالا فارمولے کے مانند ایک بظاہر نہایت سادہ لیکن باطنِ حد درجہ محکم فارمولہ بھی ہے کہ :

پاکستان کی بقا اور استحکام صرف اور صرف اسلام سے وابستہ

ہے اور احیاءِ اسلام کا واحد ذریعہ ہے تجدیدِ ایمان اور ایمان کا واحد

منبع اور سرچشمہ ہے قرآن حکیم اور دورِ حاضر میں احیاءِ قرآن کا ایک

نہایت اہم اور موثر ذریعہ ہے فکر و کلامِ اقبال !

اس لیے کہ جیسے کہ میں نے ہمیشہ کہا ہے اور علی وجہِ البصیرت کہا ہے اور آج پھر کہہ رہا ہوں اور دُنکے کی چوٹ کہہ رہا ہوں کہ عہدِ حاضر کے ذہنی و فکری ظروف و احوال میں قرآن حکیم کی عظمت کا جس قدر انکشاف اقبال پر ہوا، اور کسی پر نہیں ہوا — اور موجودہ دور کی اعلیٰ ترین علمی و فکری سطح پر قرآن کے علم و حکمت اور ہدایت و معرفت کی تعبیر و تبيين اور تشریح و توضیح کی ہے صرف — اور صرف اقبال نے !

لیکن اس کے لیے اقبال کے مداحوں اور شیعانیوں کو سچ پیش کر غافلِ عمل کوئی اگر دفتر میں ہے ؟ کے مصداق کردار اور عمل کے میدان میں اترنا ہوگا، اور ملتِ اقبال کو محض ایک روایتی اور ثقافتی طائفے کی صورت اختیار کرنے بلکہ شدتِ احساس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ مزارِ اقبال کے مجاوروں کی حیثیت اختیار کرنے کی بجائے خود اقبال کی ”خانقاہ“ سے بھی باہر نکل کر رسمِ شبیری ادا کرنی ہوگی ! اور اس کے لیے انہیں اُس ہمت و جرأت، محنت و مشقت، ایثار و قربانی اور بے نفسی و بے غرضی کے علاوہ جو کسی بھی عظیم مقصد کے لیے لازمی و لا بدی ہیں، حسبِ ذیل عملی اقدامات کرنے ہوں گے :

۱۔ اولاً جس دین و شریعت کے نام لیوا اور علمبردار ہیں اس پر خود عمل پیرا ہونا اور اگر

جان کی امان پاؤں تو عرض کر دل کا کہ اقبال کے مذاحوں اور شیدائیوں کے لیے سب سے مشکل اور کٹھن مرحلہ یہی ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے خود اقبال کی 'بے عملی' کو 'سند' کا درجہ دے دیا ہے۔ حالانکہ قطع نظر اس سے کہ خود حضرت علامہ نے اپنی بے عملی اور تن آسانی کا ہمیشہ ایک کمی کی حیثیت سے بڑا اعتراف کیا اور اُسے کبھی سند کی حیثیت سے پیش نہیں فرمایا، اُن کے فخر کے علو و عظمت کے پیش نظر اُن کی 'بے عملی' کی کوئی اہمیت نہیں رہتی بلکہ بلامبالغہ مجھ ایسے لاکھوں انسانوں کا 'عمل' اُن کی 'بے عملی' پر پُراور کیا جاسکتا ہے۔ لیکن

دوسرا کون ہے جو اس کا مدعی بن کر سامنے آ سکے؟ مولانا مودودی مرحوم نے تو حضرت علامہ کو صوفیائے 'لامنتیہ' گروہ سے متعلق قرار دیا ہے جو اپنے 'عمل' کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپانے کے لیے 'بے عملی' کا مظاہرہ کرتے ہیں، میں یہاں تک بھی نہیں جاتا بلکہ اسے اُس قاعدہ کلیہ کے ذیل میں شمار کرتا ہوں کہ نابغہ لوگوں کا عمل بالعموم اُن کے فکر کا ساتھ نہیں دے سکتا، تاہم اصل بات یہ ہے کہ حضرت علامہ میں وہ فکر دے گئے جو اس دور کے لاکھوں نہیں کرڈروں 'باعمل' لوگ بھی نہیں دے سکتے تھے لیکن اب اس فکر کو علامہ برائے کار لانے کا اولین تقاضا ہے "شرط اول قدم اس است کہ مجنوں باشی؛ کے مصداق اُس اسلام پر بالفعل عمل پیرا ہونا ہے جس کی تعبیر حضرت علامہ نے یوں فرمائی کہ "عاشقی بہ محکم شواہز تقلید یار؛"

اس ضمن میں اس مغالطے پر سزا د جس تضاد کا مظاہرہ علامہ مرحوم کے حلقہ بگوشوں میں نظر آتا ہے اُس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ بالفرض وہ داڑھی اس لیے نہیں رکھتے کہ علامہ نے نہیں رکھی تو اسی دلیل کے تحت اپنے گھر میں پردہ کیوں رائج نہیں کرتے حالانکہ اس موضوع پر حضرت علامہ کے افکار و آراء بھی نہایت واضح اور روز روشن کی طرح عیاں ہیں اور اُن کا عمل تو اُس سے بھی کہیں زیادہ روشن و تابناک ہے اس ضمن میں اس وقت مزید کچھ عرض کرنے سے اس لیے گریز کرتا ہوں کہ اس دور میں حضرت علامہ کے اس شعر کا مصداقِ کامل میں ہوں کہ:

کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتبوب پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند!

ماہم یہ صرف ایک مثال ہے۔ ”قیاس کن زنگستان من بہار مرا!“
 ۲۔ ثانیاً اس عظیم مقصد کے لیے علماء کرام کا تعاون حاصل کیا جائے

اور اس ضمن میں حضرت علامہ کی اُن تنقیدوں اور لطیف اور مزاحیہ انداز کی اُن پھبتیوں کے ساتھ ساتھ جو انہوں نے روایتی تلامذہ پر پشت کی ہیں اُن کے اس طرز عمل کو نگاہ میں رکھا جائے کہ انہوں نے ہمیشہ علامہ کی کا احترام کیا۔ یہاں تک کہ اپنے تمام تر مرتبہ علمی و فکری کے باوجود بالغ نظر اور وسیع الذہن علماء سے خالص طالب علمانہ انداز میں کسب فیض میں کبھی اپنی توہین یا سبکی محسوس نہیں کی۔ چنانچہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ساتھ اُن کی خط و کتابت اس پر شاہد عادل ہے۔

خصوصاً فقہ و قانون اسلامی کے ضمن میں اس دور میں اجتہاد کے سب سے بڑے داعی اور علمبردار ہونے کے باوجود انہوں نے خود اپنے آپ کو کبھی مجتہد مطلق نہیں سمجھا۔ بلکہ اس کے باوجود کہ عربی زبان پر انہیں عبور حاصل تھا، قرآن اُن کے رگ و پلے میں سرایت کیے ہوئے تھا اور خود وہ تمام عمر قرآن میں غوطہ زنی کرتے رہے تھے، حکمت دین اُن کے ذہن و فکر کی جزو لاینفک تھی اور تفقہ فی الدین اُن کا اڑھنا بچھونا تھا۔ قانون اسلامی کی تدوین نو کے ضمن میں انہیں کبھی یہ خیال تک نہیں آیا کہ وہ تنہا اس کے اہل ہیں بلکہ کے معلوم نہیں کہ وہ اپنی حیات دینی کے آخری ایام تک یہی وقت مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیریؒ سے درخواست فرماتے رہے کہ وہ کسی طرح لاہور منتقل ہو جائیں تو دونوں مل کر وقت کی اس اہم ترین ضرورت سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کریں۔

اس ضمن میں قدیم اور جدید کے امتزاج کی جس قدر فکر اور خواہش حضرت علامہ کو تھی اُسی کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مفسور کی تحریروں میں اس امتزاج کی جھلک دیکھ کر حضرت علامہ نے انہیں دکن کی سنگلاخ زمین سے ہجرت کر کے پنجاب آنے کی دعوت دی اور اپنے ایک عقیدت مند چودھری نیاز علی مرحوم کے ذریعے پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اُن کے ٹکٹن کی سبیل پیدا فرمائی۔ مجھے حضرت علامہ کے اس اقدام

کاپس منظر نظر آتا ہے اُن کے اس قطعے میں جَوَاح بھی اُن کے مرقہ کی زینت بنا ہوا ہے کہ

بیانا کا ہر ایں امت بسانیم۔ قمارِ زندگی مردانہ بازی

چناں نالیم اندر مسجدِ شہر دے درسیۂ تلا گدازیم

لیکن افسوس کہ مولانا مرحوم نے برصغیر کے مسلمانوں کی قومی جدوجہد کے نقطہ عروج کے آغاز پر تو یہ کہہ کر قومی سیاست سے علیحدگی اختیار کر لی تھی کہ 'یہ مسلمانوں کا نہیں صرف اسلام کا کام کرنا چاہتا ہوں'۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد اسلام کے کام کے لیے قومی ہی نہیں خالص سیاسی راستہ اختیار کر لیا۔ اس پر تو اس وقت میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ کاش کہ ایسا نہ ہوتا! اور مولانا مرحوم قیام پاکستان کے بعد بھی اپنے سابق انقلابی طریق کار ہی پر عمل پیرا رہتے، تاہم فکرِ اقبال کے شیدائیوں کی توجہ اس جانب مبذول کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جس چیز کی اہمیت حضرت علامہ کو اس وقت محسوس ہوئی تھی وہ آج بھی نہایت اہم ہے! اور قدیم و جدید کے محکم انتزاع اور علمائے حق کے تعاون و اشتراک کے بغیر پاکستان کی قومی سیاست کے دھارے کے رخ کو اسلام کی جانب موڑنا ناممکن ہے۔

آخر میں جلسہ شکر کا مجلس سے طویل سع فراشی کے لیے معذرت خواہی کے ساتھ ساتھ کارکنانِ مرکزِ یہ مجلس اقبال کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے مجلس اقبال میں شرکت کی دعوت دے کر میرا اعزاز و اکرام بھی فرمایا۔ اور مجھے یہ موقع بھی عنایت فرمایا کہ اپنا درودِ دل ایسے منتخب روزگارِ حضرات کی محفل میں بیان کر سکوں اور اخروہ عوانا ان الحمد للہ رب العالمین کے مطابق سب سے آخر میں شکریہ ادا کرتا ہوں اللہ کا کہ اُس نے مجھے بھی تین دن کی مختصر مدت کے اندر اپنے خیالات کو قلمبند کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور میرے ساتھیوں کو بھی ہمت دی کہ اسی قلیل عرصہ میں اس کی طباعت کا مرحلہ طے کر لیا۔ اگر ہم سے کوئی خیر بن آئے تو یہ سب اللہ ہی کی توفیق سے ہوتا ہے۔ اور خطا ہوتی ہے تو وہ ہمارے نفوس کی ثلثت سے۔ اقول قولیٰ ہذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات۔

حیات و سیرت اقبال

فلسفہ اقبال

اور

ملت اسلامیہ کے نام

اقبال کا پینم

اس

پروفیسر یوسف سلیم حشقی

تعارف (از قلم: ڈاکٹر اسرار احمد)

پروفیسر یوسف سلیم چشتی ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جنہیں ایک طویل عرصے تک علامہ اقبال مرحوم کی خدمت میں حاضری کا موقع مسلسل ملتا رہا۔ ۱۹۳۳ء میں جبکہ علامہ اقبال مرحوم بقید حیات ہی تھے پروفیسر صاحب نے اقبال کا پیغام کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں ابتداءً علامہ کے سوانح حیات اور ان کی سیرت کا ایک اجمالی خاکہ دیا گیا تھا اور پھر علامہ کے فلسفے کے اجمالی تعارف کے لیے اوّل ان کی اس تحریر کا ترجمہ کیا گیا تھا جو انہوں نے پروفیسر نکلسن کی فرمائش پر اپنے فلسفیانہ افکار کی وضاحت کے لیے خود لکھی تھی اور ثانیاً پیغام اقبال کے مختصر لیکن جامع تعارف کے طور پر مثنوی اسرار و رموز کے مباحث کا خلاصہ مرتب کیا گیا تھا۔ پروفیسر صاحب کی ان گنت تحریروں کی طرح یہ تحریر بھی مسودات کے انبار میں دبی ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب اپنے کسی اور مضمون کی تلاش میں مسودات کی درق گردانی کر رہے تھے کہ اتفاقاً یہ سامنے آگئی جو انہوں نے راقم کو مرحمت فرمادی۔

اس تحریر کا اصل حجتہ علامہ مرحوم کے فلسفیانہ افکار اور ان کے اس پیغام پر مشتمل ہے جو انہوں نے ملت اسلامی کو دیا ہے۔ تاہم حیات و سیرت اقبال کا اجمالی خاکہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ علامہ مرحوم کی زندگی پر بہت مفصل کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں اور ان کی زندگی کے اہم واقعات تو اکثر لوگوں کے ذہن میں ویسے بھی محفوظ ہیں، تاہم اس اعتبار سے یہ تحریر بہت دلچسپ اور قدیمے غور و حثیت کی حامل ہے کہ یہ علامہ کی زندگی ہی میں ان کے ایک حلقہ بحث و گفتگو اور عقیدت مند کے قلم سے نکلی تھی۔ خود علامہ مرحوم کے علاوہ ان کے والد ماجد اساتذہ کرام اور ہم عصر مفکرین پر جو نوٹ و مضمون اس مضمون میں آگئے ہیں ان کی اہمیت اپنی جگہ تسلیم ہے اور ان سے اس مضمون کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس مضمون کو پڑھتے ہوئے یہ امر ذہن میں سمجھ کر لکھا جائے کہ یہ ۱۹۳۳ء میں لکھا گیا تھا چنانچہ بہت سی باتیں جو اس مضمون میں بصیغہ حال بیان ہوئی ہیں کب کی تھیں ماضی بن چکیں چنانچہ کہیں کہیں انسان ایک دم چونک سا جاتا ہے۔ اس میں ایک خزانہ عبرت پنہاں ہے۔

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرفِ مہرمانہ

(ماخذ از یشاق، بابت سہ ۱۹۶۹ء)

حیات و سیرت اقبال

ایک اجمالی خاکہ

علامہ العصر ترجمان حقیقت ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال مدظلہ کے آباؤ اجداد کشمیری پنڈت تھے جن کی گوت ”سپر دھتی“ وہ ایک بالکال ولی اللہ کے ہاتھ پر شرف باسلام ہوتے تھے اور اس ولی کار و دعائی تصرف آج تک ان کے خاندان میں چلا آتا ہے اور وہ حسن عقیدت جس نے سپر و کو شیخ بنادیا ہنوز آرزو ہے۔ اقبال نے خود بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مراجگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی

برہمن زاوہ رمز آشنائے روم و تبریز است

اسی لیے اقبال کو کشمیر اور کشمیریوں دونوں سے قدرتی طور پر لگاؤ ہے چنانچہ ان

کے کلام میں دونوں کے متعلق رموز و نکات موجود ہیں مثلاً :

کشمیری کہ باندگی خو گرفتہ جیتے می تراشد ز سنگ مزارے

ڈاکٹر صاحب ۱۸۷۶ء یا ۱۸۷۷ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے تھے۔ والدین

نے اقبال نام رکھا۔ میرا خیال ہے اس وقت کس کو یہ خیال ہوگا کہ آئندہ چل کر یہ لڑکا واقعی صاحب اقبال ہوگا۔ اور ایک مثنوی ایسی لکھ کر دنیا کو دے جائے گا، جس کی قدر و قیمت قیامت تک باقی رہے گی۔

* حاشیہ کے لئے صفحہ ۱۰۳ ملاحظہ فرمائیے۔ قارئین کی سہولت کے پیش نظر تمام حواشی ان مضامین کے اختتام پر جمع کر دیئے گئے ہیں۔

ابتداءً مکتب میں داخل ہوئے اس کے بعد سکول میں نام لکھایا اور مشن ہائی سکول سیالکوٹ سے میٹرک پاس کر کے مقامی (مرے کالج) میں داخل ہوئے۔ یہاں آپ کو ٹیس العلماء مولانا سید میر حسن صاحب کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ استاد کو جوہر قابل ہاتھ لگ گیا۔ فیض صحبت سے چمکا دیا، ادب اور شاعری کا صحیح مذاق پیدا کر دیا۔ یہ سچ ہے کہ شاعری کا ملکہ فطری طور پر ودیعت تھا۔ لیکن مولانا کی صحبت نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔

غالباً شاعری کی ابتدا اسی زمانہ سے ہوئی۔ افسوس کہ ابتدائی کلام التادیر کا معدوم کا مصداق ہے۔

ایف اے پاس کرنے کے بعد آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ فلسفہ اور عربی لے کر بی اے پاس کیا۔

۱۸۹۹ء میں فلسفہ میں ایم اے پاس کیا۔ اس امر کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں کہ علامہ موصوف شروع سے آخر تک ہم چٹھوں میں معروف اور ممتاز رہے۔

اسی سال آپ اوٹیل کالج لاہور میں فلسفہ اور اقتصادیات کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ دوسرے سال گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے اسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے۔

جس طرح ابتدا میں مولانا میر حسن نے، اسی طرح طالب علمی کے آخری دور میں ڈاکٹر آرٹلڈ کی صحبت نے آپ کی مخفی قوتوں کو بیدار کر دیا اور سونے کو کندن بنا دیا۔ پہلے شاگردی تھی کچھ عرصہ کے بعد دوستی کا سلسلہ قائم ہو گیا جو مدت العمر باقی رہا۔ آرٹلڈ اپنے شاگرد کی جودتِ طبع کے معترف تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا کہ جس استاد کو اقبال سا شاگرد میسر آجائے وہ رفعتِ رفیع بن جاتا ہے۔

ایم اے پاس کرنے کے بعد بھی آپ کے مطالعہ اور علمی مشاغل میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ اور زیادتی ہو گئی۔ اسی اثنا میں آپ نے اقتصادیات پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

۱۹۰۵ء میں آپ ولایت تشریف لے گئے۔ کیمبرج سے فلسفہ اخلاق میں ڈگری

لی۔ اس کے بعد میونخ سے DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA لکھنے پر
پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی پھر لندن واپس آئے۔ بیرسٹری پاس کی اور ڈاکٹر آرنلڈ کی
غیر حاضری میں چھ ماہ تک ان کے قائم مقام کی حیثیت سے لندن یونیورسٹی میں عربی کے
پروفیسر بھی رہے۔

تین سال قیام کرنے کے بعد ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو بروز دوشنبہ شام کی گاڑی سے
لاہور واپس آئے۔ دوران قیام انگلستان میں آپ کو مشاہیر علماء اور فضلا کی صحبت سے مستفید
ہونے کا موقع ملا۔ ان میں کیمبرج کے ڈاکٹر میک ٹیگرٹ، ڈاکٹر براؤن، ڈاکٹر بکلسن اور ڈاکٹر
سارٹے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

کچھ دن وطن میں قیام کرنے کے بعد آپ نے لاہور میں مستقل طور پر سکونت اختیار
کر لی۔ پہلے انارکلی میں رہائش تھی۔ اب ایک عرصہ سے میکلوڈ روڈ پر قیام ہے۔ اقبال کی وجہ سے
مجھے اس سڑک سے دہی دانگی ہے۔ جو محبوں کو کونے لیلی سے تھی۔

۱۹۳۳ء میں جاوید منزل ————— ۱۹۳۸ء میں وفات

اگرچہ ڈاکٹر صاحب ۱۹۰۸ء سے پمپٹس کرتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ انہیں اس
پیشہ سے کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں ہوتی۔ اور ہوتی بھی کیونکر۔ جو شخص دن رات کسی دوسرے عالم
میں رہتا ہو اور شاعرانہ دل و دماغ، فلسفیانہ مزاج، صوفیانہ افتاء و طبع اور عالمانہ طرز زندگی رکھتا
ہو، جو VISIONARY IDEALIST ہو۔ جس کی توجہ تمام تر ملت اسلامیہ کی بہبود پر مبذول
رہتی ہو۔ جس کے دل میں قوم کا درد رہ کر چٹکیاں لیتا ہو جو سراپا سوز و گداز ہو جس کا بہت سا
وقت EGO اور REALITY کے متعلق غور و فکر میں بسر ہوتا ہو۔ جو اسرار خودی کا مصنف
ہو اسے نظرِ دیوانی اور ”مثلاً فوجداری“ سے کیا خاک دلچسپی ہو سکتی ہے؟

۱۹۲۳ء میں سرکارِ برطانیہ نے آپ کو SIR کا خطاب دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے
کبھی خطابات یا اعزازات کے لیے خواہش یا کوشش نہیں کی اور نہ وہ اس خطاب کو کسی

خاص قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ کسی دوسری دنیا میں رہتے ہیں جہاں SIR اور SERVANT دونوں یکساں نظر آتے ہیں۔
بندہ صاحب محتاج و غنی ایک ہوتے تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوتے

اقبال کی شاعری

یوں تو شاعر ماں کے پیٹ سے شاعر بن کر آتا ہے۔ لیکن جس وقت یہ ملکہ ظاہر ہوتا ہے اس وقت سے شاعر کی شاعری کا آغاز تصور ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اقبال کی شاعری کا آغاز ۱۸۹۵ء سے سمجھنا چاہیے۔ اس زمانہ میں اور اس سے پہلے آپ کی سخن گوئی صرف لہجہ اور کالج کے طلبہ تک محدود رہتی۔ لیکن ۱۸۹۶ء میں آپ نے جلسوں میں شرکت شروع کی اور اس طرح آپ کی خدا داد قابلیت کا شہرہ عام ہونے لگا۔

غالباً دوستوں نے مشورہ دیا ہو گا کہ آپ کو کسی بالکمال استاد سے مشورہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ استاد بہر حال، خوب کو خوب تر بنا دیتا ہے یا آپ نے خود اس ضرورت کو محسوس کیا ہو گا۔ بہر کیف آپ نے ٹیبل ہند نواب فصیح الملک بہادر، مرزا داغ دہلوی، استاد اعلیٰ حضرت نظام دکن مرحوم کو خط لکھا کہ مجھے اپنی سلک شاگردی میں منسلک کر لیجئے اور چند غزلیں بھی اصلاح کے لیے بھیجیں۔

تملے کا یہ سلسلہ دیر تک قائم نہیں رہا۔ ہاں بقول آذربیل حبش شیخ سر عبد القادر صاحب بالقابہ اس کی یاد دونوں طرف باقی رہ گئی: اقبال کی خوش نصیبی کہ اسے داغ جیسا زبان دان اور کامل الفاضل استاد ملا اور داغ کی بلند نبی کہ اقبال اس کے شاگردوں کی ممتاز صف میں شامل ہوا۔ شیخ صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہے جن کے کلام پر انہوں نے اصلاح دی۔ مجھے خود دکن میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اور میں نے خود ایسے فخریہ کلمات ان کی زبان سے سنے۔

اقبال نے خود بھی ایک بغزل کے مقطع میں داغ کے شاگرد ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

نیم نشہ ہی اقبال کچھ اس پنہیں ناں مجھے بھی فخر ہے شاگردی داغِ مخند کا
سب سے پہلے لاہور میں، سب سے پہلے مشاعرہ میں آپ نے جو غزل پڑھی اس کا

مقطع یہ ہے:-

اقبال لکھنؤ سے مدلی ہے غرض ہم تو اسیر ہیں غمِ زلفِ کمال کے
چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جو شعراء قوموں کو زمرہ حیات سنانے آتے ہیں وہ مکانی اور زانی دونوں قیود
سے آزاد ہوتے ہیں۔ اقبال نے رفتہ رفتہ اپنی طرز وہی کر لی جو ان کے لیے مناسب تھی۔ یعنی
۱۹۱۱ء سے اقبال کی شاعری اسلامی شاعری ہو گئی۔ ۶ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو بادشاہی مسجد لاہور میں آپ
نے ”سخن شہدا“ کی نذر کے عنوان سے جو نظم پڑھی، اس نے ایک قیامت برپا کر دی۔ جس
وقت آپ نے یہ شعر پڑھا۔

جھلکتی ہے تری انت کی آبرو اس میں

ظاہر اس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

تو مسجد میں کہرام مچ گیا تھا۔ آنچہ از دل می خیزد بر دل می ریزد۔ والا مضمون ہے ہر آئینہ نظمِ سنہ
درونی کی آئینہ دار ہے۔

اقبال کی سیرت

علامہ موصوف کو دیکھنے اور ان کی صحبت سے مستفید ہونے کا بارہا مشرف حاصل ہو چکا
ہے۔ اس لیے جو کچھ لکھتا ہوں وہ میرے ذاتی خیالات ہیں۔ ان سے مل کر جو نقوش دل پر جم
چکے ہیں انہیں الفاظ کا جامہ پہناتا ہوں۔

پہلی بات جو ہر شخص کو متاثر کرتی ہے وہ ان کی عظیم النظیر سادگی ہے۔ سادہ لباس،
سادہ رہائش، سادہ زندگی، سادہ گفتگو، غرضیکہ ہر بات سے سادگی ٹپکتی ہے۔ لیکن دماغ ہر وقت

آسمان کے تارے توڑ کر لاتا رہتا ہے۔ اسی کو انگریزی میں کہتے ہیں (PLAIN LIVING AND HIGH THINKING)

دوسری بات یہ ہے کہ علامہ کا در فیض ہر کس و ناکس کے لیے آسمانوں پہر کھلا رہتا ہے۔ اگر ناسٹوں اور خان بہادروں کو آسانی باریابی ہو جاتی ہے تو ہم جیسے خاک نشین بھی بے دھڑک اسلام علیکم کہہ کر خان علم فضل کی زلہ ربانی کا شرف حاصل کر لیتے ہیں "صاحب" کے پاس کارڈ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ وہ شہرت سے مستغنی ہیں۔ اگر وہ سبکل کے مروج اصول پڑاؤ کو استعمال کرتے، تو بہت شہرت حاصل کر لیتے۔ ان کا وقت زیادہ تر ملت اسلامیہ کی بہبود کی تہیہ سوچنے میں بسر ہوتا ہے۔ شہرت اور منزلت یوں بھی کچھ کم نہیں ہے۔ وہ بلاشبہ بین الاقوامی شہرت اور منزلت کے آدمی ہیں۔ ایشیا، یورپ، افریقہ اور امریکہ اقبال کے مداح کہاں نہیں ہیں؟ شہرت شعرش بگیتی بعد او خواہد شدن

چوتھی بات یہ ہے کہ اقبال اپنے سینہ میں سوز و گداز سے لبریز دل رکھتے ہیں۔ یوں نے بار بار دیکھا ہے کہ کسی نکتہ کو سمجھاتے سمجھاتے بے اختیار آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ سرکارِ دو عالم سے جو عشق ہے اس کی نظیر ابھی تک تو کسی ملکیہ سودراز میں دیکھی نہیں!!!

یوں تو ہر شاعر پر کیف ہوتا ہے۔ سوز و گداز سے لبریز ہوتا ہے۔ لیکن اقبال سوز عشق مصطفیٰ سے مالامال ہیں اسی لیے مجھے ان سے ایک عجیب والہانہ عقیدت ہے۔

حُب رسولؐ کے لیے نہ ٹخنوں سے اونچا پا جامہ چاہیے نہ طویل اللحیہ اور قصیر الشارب ہونے کی ضرورت ہے۔ صرف دردِ آشناد دل درکار ہے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ وہ تنہائی پسند اور عزلت گریں ہیں اور ایک مفکر کے لیے یہ بات عجیب و غریب نہیں۔

علامہ جو صوف کو اپنی والدہ مرحومہ سے بہت الفت تھی اور میری ان سے عقیدت کی

یہ دوسری وجہ ہے کیونکہ اگر اسلام میں خدا کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں خود اپنی والدہ کی پیش کرتا انہوں نے والدہ مرحومہ کی یاد میں جو نظم لکھی ہے وہ ان کے جذباتِ محبت کی قدر کے ترجمانی کرتا ہے۔

علامہ کی تصنیفات

(۱)	علم الاقتصاد	اُردو	نایاب ہے۔
۲-	فلسفہ ایران	انگریزی	مل سکتی ہے
۳-	اسرارِ خودی	فارسی	" " "
۴-	رموزِ بے خودی	"	" " "
۵-	پیامِ مشرق	"	" " "
۶-	زبورِ عجم	"	" " "
۷-	لکچرِ مدراس	انگریزی	" " "
۸-	جاویدِ نامہ	فارسی	" " "
۹-	بانگِ درا	اُردو	" " "
۱۰-	بالِ جبریل	"	" " "
۱۱-	ضربِ کلیم	"	" " "
۱۲-	مسافر	فارسی	" " "
۱۳-	"پس چہ باید کرد"	"	" " "
۱۴-	ارمغانِ حجاز	فارسی و اُردو	" " "

قدر دانی

عام قاعدہ تو یہ ہے کہ شعراء، حکماء، فلاسفہ کی قدر اُن کے بعد ہوتی ہے۔ لیکن اقبال کی شہرت اُن کی زندگی ہی میں کافی ہو چکی ہے۔

(۱) ترکی زبان میں عربی زبان میں اور انگریزی زبان میں ان کی بہت سی نظموں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر ٹکسن نے اسرار خودی کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے۔ کئی جرمن علمائے علامہ کے کلام اور فلسفہ پر تبصرہ جرمن زبان میں شائع کیا ہے۔ ان کے علاوہ یورپ کی مختلف زبانوں میں، ان کے فلسفہ پر محققانہ مضامین لکھے گئے ہیں۔

(میشاق مئی ۱۹۶۹ء)

فلسفہ اقبال

علامہ اقبال مرحوم بلاشبہ ایک عظیم شاعر ہی نہیں، بہت بڑے فلسفی بھی تھے۔ ان کے فلسفہ کو عام طور پر فلسفہ خودی کا نام دیا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ بہت ہی کم لوگ اس سے واقف ہیں کہ ان کا اصل فلسفہ ہے کیا:

یہ تو سب ہی کو معلوم ہے کہ علامہ کی معرکہ الہامی اشعار اسرار خودی کا ترجمہ انگریزی میں پروفیسر نکلسن نے کیا ہے لیکن یہ بات عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں کہ پروفیسر موصوف نے خود اسرار خودی کو سمجھنے کے لیے اولاً ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم سے مدد لی جو اس وقت کیمبرج میں اپنے تحقیقی کام میں مصروف تھے (یہ ذکر ۱۹۱۸ء کا ہے) اور پھر جب اس ساری ہنگامہ و دود کے باوجود وہ علامہ مرحوم کے فلسفہ کو اچھی طرح نہ سمجھ پاتے تو انہوں نے خود علامہ سے رجوع کیا اور فرائش کی کہ وہ اپنے فلسفیانہ خیالات کو ایک مختصر لیکن جامع مضمون کی صورت میں زبان انگریزی تحریر کر دیں۔ علامہ نے اس فرائش کی تعمیل میں جو مضمون لکھا اسے پروفیسر نکلسن نے "Secrets of the Self" کے شروع میں شامل کر دیا جو ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی تھی۔

ذیل میں ایک تو اس تحریر کا وہ ترجمہ درج کیا جا رہا ہے جو پروفیسر حشمتی صاحب نے ۱۹۳۲ء میں کیا تھا اور دوسرے مثنوی اسرار خودی کا وہ خلاصہ بھی درج کیا جا رہا ہے جو پروفیسر صاحب نے اسی زمانے میں خود مرتب کیا تھا۔ مزید برآں رموز بے خودی کا خلاصہ بھی آئندہ صفحات میں قارئین کی نظر سے گزرے گا، اسے بھی پروفیسر صاحب نے اسی زمانے میں مرتب کیا تھا۔

اس طرح یہ مضمون نہ صرف یہ کہ علامہ اقبال کے فلسفہ پر نہایت مختصر لیکن انتہائی جامع اور ساتھ ہی غایت درجہ عام فہم دستاویز کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ بلکہ اس کے ذریعے اس پیغام کا خلاصہ بھی سامنے آجائے گا جو علامہ مرحوم نے امت مسلمہ کو دیا تھا اور یہ تینوں مضمون مل کر ایک مکمل وحدت کی صورت اختیار کر لیں گے۔ واضح رہے کہ دونوں بے خودی کا ترجمہ بعد میں پروفیسر آذربہی نے کیا جو ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ ————— اسرار احمد (یشاق، جون ۱۹۶۹ء)



(۱)

اقبال کے فلسفہ کا اجمالی خاکہ

جو انہوں نے ہمکس کی فرمائش پر خود تحریر فرمایا

ترجمہ : پروفیسر یوسف سلیم چشتی

ہر موجود میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ حیات تمام و کمال انفرادی ہے۔ خود خدا بھی اک فرد ہے۔ اگرچہ فرد کامل ہے۔ کائنات افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔ لیکن اس مجموعہ میں جو نظم و نسق اور توافقی و تطابق پایا جاتا ہے وہ بذاتہ کامل نہیں ہے۔ اور جو کچھ بھی ہے وہ افراد کی جبلی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ہمارا قدم تدریجی طور پر بدلتی اور انتشار سے نظم و ترتیب کی طرف اٹھ رہا ہے۔ افراد کائنات کی تعداد معین نہیں ہے۔ اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ یعنی کائنات فعل مختتم نہیں ہے۔ ہنوز مراتب تکمیل طے کر رہی ہے اسی لیے اس کے متعلق کوئی بات قطعی اور اذعاناً طور پر نہیں کہی جاسکتی۔ فعل تخلیق ہنوز جاری ہے اور جس حد تک انسان اس

کائنات کے کسی غیر مربوط حصہ میں ربط و ترتیب پیدا کر سکتا ہے اس حد تک اس کو بھی فعل تخلیق میں معاون قرار دیا جاسکتا ہے۔ خود قرآن مجید میں خدا کے علاوہ دوسرے خالقوں کے امکان کی طرف اشارات پائے جاتے ہیں: **فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ**۔

ظاہر ہے کہ کائنات اور انسان کے متعلق یہ نظریہ ہیگل اور اس کے ہم خیالوں اور ارباب وحدت الوجود سے بالکل مختلف ہے جن کے خیال میں انسان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ وہ خدایا حیات کلی میں جذب ہو جائے اور اپنی انفرادی ہستی مٹا دے۔

میری رائے میں انسان کا اخلاقی اور مذہبی منتہائے مقصود یہ نہیں کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دے۔ یا اپنی خودی کو فنا کر دے بلکہ یہ کہ وہ اپنی انفرادی ہستی کو قائم رکھے اور اس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے اندر بیش از بیش انفرادیت پیدا کرے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے: **”تَخْلُقُوا بِاخْلَاقِ اللَّهِ“** یعنی اپنے اندر صفات الہیہ پیدا کرو پس انسان جس قدر خدا سے مشابہ ہوگا۔ اسی قدر اس کے اندر شان بختیائی اور رنگ انفرادیت پیدا ہوتا چلا جائے گا۔

حیات کیا ہے؟ فرد کا دوسرا نام حیات ہے اور فرد کی اعلیٰ ترین صورت، جو اس وقت تک معلوم ہو چکی ہے خودی (EGO) ہے۔ اگرچہ جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے انسان ایک مستقل بالذات مرکز ہے لیکن ابھی تک فردِ کامل کے مرتبہ کو نہیں پہنچا۔ فرد جس قدر خدا سے قریب ہوگا۔ اسی قدر کامل ہوگا۔ قرب الہی کا مطلب یہ نہیں کہ انسان خدا کی ذات میں فنا ہو جائے، بلکہ اس کے عکس یہ کہ خدا کو اپنے اندر جذب کر لے۔ حیات دراصل اک ترقی کرنے اور کائنات کو اپنے اندر جذب کرنے والی حرکت کا نام ہے۔ جو رکاوٹیں اس کی راہ میں حائل ہوتی ہیں ان پر غلبہ پاکر آگے بڑھتی ہے۔ حیات کا خاضہ یا جوہر طبعی یہ ہے کہ وہ مسلسل نئی آرزوئیں پیدا کرتی رہتی ہے۔ اپنی حفاظت اور ترقی کے لیے اس نے آلات اور وسائل پیدا کر لیے ہیں مثلاً حواس اور ادراک جن کی بدولت وہ مشکلات پر غالب آتی ہے۔ مادہ حیات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے لیکن مادہ کوئی بڑی چیز نہیں۔ بلکہ حیات

کے حق میں مفید ہے کیونکہ اسی کی وجہ سے حیات کو اپنی مخفی قوتوں کے بروئے کار لانے کا موقع ملتا ہے۔

جب حیات یا خودی مشکلات پر غالب آجاتی ہے تو مرتبہ جبر سے مرتبہ اختیار پر فائز ہو جاتی ہے۔ خودی ایک حد تک مجبور ہے اور ایک حد تک مختار۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے ”الْإِيمَانُ بَيْنَ الْجَبْرِ وَالْإِخْتِيَارِ“ حیات جب تقرب الہی حاصل کر لیتی ہے تو اختیار کے اعلیٰ ترین مرتبہ پر پہنچ جاتی ہے۔ مخقر یہ کہ حیات یا خودی، مرتبہ جبر سے مرتبہ اختیار تک پہنچنے کا نام ہے۔

جب حیات انسانیت کا جامہ اختیار کر لیتی ہے تو اس کا نام الیغویا شخص یا خودی ہو جاتا ہے اور شخصیت جدوجہد کی مسلسل حالت سے عبارت ہے شخصیت کا قیام اسی حالت کے تسلسل پر منحصر ہے اگر یہ حالت قائم نہ رہے تو لامحالہ تعطل یا ضعف کی حالت طاری ہو جائے گی اور یہ بات خودی کے حق میں ہم قائل ہے۔۔۔ شخصیت (PERSONALITY) چونکہ انسان کا سب سے بڑا کمال ہے اس لیے اس کا فرض اولین یہ ہے کہ وہ اس جوہر بے بہا کو مسلسل سرگرم عمل رکھے اور وہ عمل ایسا ہو کہ خودی کی ترقی کا باعث ہو۔ اسی کو مذہب کی اصطلاح میں ”عمل صالح“ کہتے ہیں۔ اسی لیے قرآن میں بار بار اس کی تاکید آتی ہے۔

مسلسل جدوجہد ہی زندگی ہے (ع۔ دوام باز سوزنا تمام است) جو شے شخصیت کو بہم جدوجہد کی طرف راغب کرتی ہے وہ دراصل ہمیں بقائے دوام کے حصول میں مدد دیتی ہے اس لیے حسن یا اچھی ہے اور جو شے شخصیت کو ضعیف یا معطل کرے وہ بُری ہے۔ گویا ہماری شخصیت جملہ اشیائے کائنات کے حسن و قبح کا معیار ہے۔ مذہب، اخلاق اور آرٹ سب کو اسی معیار پر پرکھنا چاہیے۔

PERSONALITY AS THE CRITERION OF VALUE

میں نے افلاطون کے فلسفہ پر جو تنقید کی ہے اس سے میرا مطلب اخلاقی غیاء مذہب

کی تردید ہے جو بقا کے عوض فنا کو انسان کا نصب العین قرار دیتے ہیں۔ یہ مذاہب انسان کو بزدلی سکھاتے ہیں۔ ان مذاہب کی تعلیم یہ ہے کہ مادہ کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس سے گریز کرنا چاہیے۔ حالانکہ انسانیت کا جوہر یہ ہے کہ انسان مخالف قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کرے اور انہیں اپنا خادم بنالے۔ اُس وقت انسان "خلیفۃ اللہ" کے مرتبہ پر پہنچ جائے گا۔

جس طرح خودی کو مرتبہ اختیار پر فائز کرنے کے لیے ہمیں "مادہ" پر غالب آنا ضروری ہے اُسی طرح اسے غیر فانی بنانے کے لیے ہمیں "زمانہ" پر غالب آنا لازمی ہے۔ مرتبہ بقا وہی شخص حاصل کر سکتا ہے جو اس کے لیے جدوجہد کرے اور اس کا حصول ہمارے افکار اعمال کے ان طریقوں پر منحصر ہے جو خودی کی حالت کاوش پیہم کو برقرار رکھ سکیں۔ بدھ مذہب اور ایرانی تصوف اس حالت کے لیے مفید نہیں ہیں۔

اگر خودی کی حالت کاوش برقرار رہے تو لگان غالب یہ ہے کہ موت کا صدر جاری عذبی کو متاثر نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے کہ موت موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان ایک وقفہ سکون ہو جسے قرآن شریف عالم برزخ سے تعبیر کرتا ہے۔ موت کا صدر صرف وہ افراد برباشت کر سکیں گے جنہوں نے اس زندگی میں اپنی خودی کو بچھڑ کر لیا ہوگا۔

اگر چہ حیات اپنے ارتقائی منازل میں اعادہ اور تکرار کو پسند نہیں کرتی تاہم جیسا کہ ولڈن کلا نے لکھا ہے حشر اجساد بھی عین قرین عقل ہے۔ زمانہ کو لمحات میں تقسیم کر دینے سے ہم اُسے مکان سے وابستہ کر سکتے ہیں اور اسی لیے اس کو عبور کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔

زمانہ کی حقیقت اس وقت آشکارا ہو سکتی ہے جب ہم اپنی ذات میں غوطہ زنی کریں کیونکہ حقیقی زمانہ خود ہماری حیات ہی ہے۔ ہم زمانہ کے محکوم اُسی وقت تک ہیں جب تک زمانہ کو مکان سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ مقیہ بال مکان زمانہ، اس زنجیر سے مشابہ ہے جس کو کسی شخص نے اپنے گرد لپیٹ لیا ہو۔ اس زمانہ کو حیات نے اپنے گرد اس لیے لپیٹ لیا ہے تاکہ موجودہ جہل کو اپنے اندر جذب کر سکے۔ دراصل ہم غیر زانی ہیں۔ اور موجودہ مقیہ بال زمانہ زندگی میں بھی کبھی

ہیں اپنے غیر زمانی ہونے کا احساس ہو سکتا ہے۔ اگرچہ یہ بالکل 'آنی' ہوگا۔

خودی میں عشق سے بچھگی پیدا ہوتی ہے عشق کے معنی ہیں کسی چیز کو اپنے اندر جذب کرنا یا جزو ذات بنانا۔ عشق کی اعلیٰ ترین صورت یہ ہے کہ ایک نصب العین اپنے سامنے رکھا جائے عشق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عاشق اور معشوق دونوں میں شانِ انفرادیت پیدا کر دیتا ہے جس طرح عشق سے خودی میں بچھگی اور توانائی آتی ہے سوال سے ضعف اور نقص پیدا ہوتا ہے۔ جو بات تمہیں ذاتی کوششوں کے بغیر حاصل ہو جائے وہ سوال کے ذیل میں آتی ہے۔ چنانچہ جو شخص باپ کے ترکہ سے دولت مند بنتا ہے وہ دراصل سائل یعنی گدا ہے۔ جو شخص دوسروں کے خیالات کو مدافحہ بناتا ہے وہ بھی سائل ہے۔

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے مسلمان کو ہے ننگ وہ بادشاہی
عشق کس طرح کرنا چاہیے؟ اس کا جواب ایک مسلمان کے لیے آنحضرتؐ کی زندگی میں موجود ہے۔ اسی لیے اللہؐ نے فرمایا "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" آپؐ نے اپنے طرز عمل سے دکھا دیا کہ عشق اس طرح کرتے ہیں۔ پس مبلمانوں کو آنحضرتؐ کا اسوۂ حسنہ اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔

ہر کہ عشق مصطفیٰؐ سامانِ اوست بھر و بدر گوشہ دامنِ اوست
ترتیبِ خودی کے تین مراحل ہیں (۱) دستورِ الہی کی اطاعت (۲) ضبطِ نفس (۳) نیابتِ الہی۔

نیابتِ الہی، دنیا میں انسانی ارتقا کی آخری منزل ہے۔ جو شخص اس منزل پر پہنچ جاتا ہے وہ اس دنیا میں خلیفۃ اللہؐ ہوتا ہے۔ وہ کامل خودی کا مالک اور انسانیت کا منہائے مقصود اور روح اور جسم دونوں کے لحاظ سے حیات کا بلند ترین مظہر ہوتا ہے۔ یعنی اس کی زندگی میں اگر حیات اپنے مرتبہ کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ کائنات کے پیچیدہ مسائل اس کی نظر میں سہل معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اعلیٰ ترین قوت اور برترین علم دونوں کا حامل ہوتا ہے اس کی زندگی میں فک اور

علم، جبلت اور ارادہ سب ایک ہو جاتے ہیں۔

چونکہ وہ سب کے آخر میں ظاہر ہوگا اس لیے وہ تمام صعوبتیں جو انسانیت کو ارتقائی منازل طے کرنے میں لاحق ہوتی ہیں برحل ہیں۔ اس کے ظہور کی پہلی شرط یہ ہے کہ بنی نوع آدم جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے ترقی یافتہ ہو جائیں۔ فی الحال اس کا وجود خارج میں موجود نہیں لیکن انسانیت کی تدریجی ترقی اس امر کی دلیل ہے کہ زمانہ آئندہ میں افرادِ کاملہ کی ایسی نسل پیدا ہو جائے گی، جو حقیقی معنوں میں نیابتِ الہی کی اہل ہوگی۔

زمین پر خدا کی بادشاہت کے یہی معنی ہیں کہ یہاں یکتا افراد کی جماعت جمہوری رنگ میں قائم ہو جائے ان کا صدر اعلیٰ وہ شخص ہوگا جو ان سب پر فائق ہوگا اور اس کا نظیر دنیا میں نہ مل سکے گا۔

نپٹنے نے بھی اپنے تختل میں افراد یکتا کی ایسی جماعت کی ایک جھلک دکھی تھی۔ لیکن اس کے نسلی تعصب نے اس تصویر کو بھونڈا کر دیا۔

(۲)

’اسرارِ خودی‘ کے مباحثِ عالیہ کا مختصر خاکہ

علامہ نے اپنے فلسفہ کی جو تشریح فرمائی ہے اس پر اضافہ کرنا میری لیاقت سے باہر ہے لیکن میں ناظرین کی آگاہی کے لیے اسرارِ خودی کے مباحث کا خلاصہ بیان کرتا ہوں تاکہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے۔

(۱) شاعری علامہ کے لیے مقصود بالذات نہیں ہے۔ ذریعہٴ اظہارِ خیالات ہے۔ لکھتے ہیں:

شاعری زیرِ مثنوی مقصود نیست بت پرستی بت گری مقصود نیست
پس جو لوگ اقبال کو محض شاعر تصور کرتے ہیں اور اس کے کلام کو عرضی قواعد پر پکتے
ہیں حقیقت سے نا آشنا ہیں۔ اقبال شاعر نہیں ”پیغام گو“ ہے۔
(۲) خودی اصل نظامِ عالم ہے اور تسلسلِ حیات استحکامِ خودی پر منحصر ہے۔ کائنات کی
ہر شے میں ”خودی“ موجود ہے۔

چوں حیاتِ عالم از روئے خودی است پس بقدرِ اتواری زندگی است
قطرہ چوں حرفِ خودی از بر کند ہستی بے مایہ را گوہر کند
(۳) خودی کی حیات و بقا، تخلیق و تولید مقاصد پر منحصر ہے جس خودی (شخص) کے سامنے
کوئی نصب العین نہیں وہ مردہ ہے اس کا عدم وجود برابر ہے۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است اصل اور در آرزو پوشیدہ است
دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات غیر حق میرد چو او گیرد حیات
زندہ را نفیِ تمنا مردہ کرد شعلہ را نقصانِ سوزِ افسردہ کرد
علم از سامانِ حفظِ زندگی است علم از اسبابِ تقویمِ خودی است
خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے۔
(۴)

از محبت می شود پائیندہ تر زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر
عشق را از تیغ و خنجر پاک نیست اصلِ عشق از آب و باد و خاک نیست
خاک بجز از فیض او چالاک شد آمد اندر وجد و بر افلاک شد
عشق کا طریقہ محمد عربیؐ سے سیکھنا چاہیے۔
(۵)

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است آبروئے مازناہم مصطفیٰ است
آنکہ بر اعداءِ رحمت کشاد مکہ را پیغامِ لا تشریب داد
امتیازاتِ نسب را پاک سوخت آتش او این خس و خاشاک سوخت
۲۳

چوں گلِ صدرِ گِمارا بویکِست اوست جانِ این نظامِ ادا کیست^{۲۵}
(۶) بغیر آپ کی اتباع کے خودی مرتبہ کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔

عاشقی بہ محکمِ شوا از تقلیدِ یار تا کند تو کند یزداں شکار^{۲۶}
تا خدائے کعبہ بنوازد ترا شرحِ اینِ جاعلِ سازد ترا^{۲۷}
(۷) خودی سوال سے یعنی دوسروں کی نقالی کرنے سے ضعیف ہو جاتی ہے اور ترقی نہیں کر سکتی۔

خودِ فردا از شترِ مثلِ عمرِ اخذر از منتِ غیرِ الخذر^{۲۸}
رزقِ خویش از نعمتِ دیگرِ مجو موجِ آب از چشمہ خاورِ مجو^{۲۹}
تا نباشی پیشِ پیغمبرِ نخل روزِ فردائے کہ باشد جاں گسل^{۳۰}
ہمت از حقِ خواہ دباگردوں سبیز آبروئے ملتِ بیضا مریز^{۳۱}
(۸) جب خودی عشق و محبت سے مستحکم ہو جاتی ہے تو نظامِ عالم کو سخر کر لیتی ہے۔

پنچہ او پنچہ حق می شود ماہ از انگشتِ او شق می شود^{۳۲}
در خصوصاتِ جہاں گردِ محکم تابعِ فرمانِ او دارا و جم^{۳۳}
(۹) مسئلہ نفیِ خودی اقوامِ مغلوبہ کی ایجاد ہے جس کی وجہ سے اقوامِ غالبہ کے قویٰ ضعیف ہو جاتے ہیں اس لیے اس مسئلہ سے احتراز کرنا لازم ہے۔ مسئلہ ہلاکت کا پیشِ خیمہ ہے۔

صدِ مرض پیدا شد از بے ہمتی کوتہ دستی بے دلی دولِ فطرتی^{۳۴}
(۱۰) افلاطون کے خیالات سے احتراز کرنا واجب ہے کیونکہ اس نے ترکِ عمل کی تعلیم دی ہے اور یہ بات خودی کے لیے ضرر ہے۔

بلکہ از ذوقِ عملِ محروم بود جانِ او وارفتہ معذورم بود^{۳۵}
میگر ہنگامہ موجود گشت خالقِ اعیانِ نامشہود گشت^{۳۶}
قوہا از مسخرِ او مسموم گشت خفت و از ذوقِ عملِ محروم گشت^{۳۷}

(۱۱) ادبیات اسلامیہ میں مثل دیگر شعبوں کے محتاج اصلاح ہیں شعراء اور ادباء کو چاہیے کہ ایسے مضامین پر قلم کریں جن سے قوم کی مردہ رگوں میں حرکت پیدا ہو۔

اے میانِ کیسے ات نقدِ سخن بر عیارِ زندگی او را بزَن ۳۸
فکرِ روشن ہیں عمل را رہبر است چوں درخشِ برق پیش از تندر است ۳۹
فکرِ صالح در ادب می باید ت رجعتے سوئے عرب می باید ۴۰
تر بیتِ خودی کے تین مراحل ہیں۔ اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الہیہ۔ (۱۲)

طاعت (۱)

در اطاعت کوشائے غفلتِ شعل می شود از جبرِ پیدا اختیار ۴۱
باطنِ ہر شے ز آئینے قوی تو چہرا غفل زایں سماں رومی ۴۲
شکوہِ سنجِ سختی آئیں مشو از حدودِ مصطفیٰ بیرون مرو ۴۳
ضبطِ نفس (ب)

ہر کہ بر خود نیت فرمائش رواں می شود فرماں پذیر از دیگران ۴۴
تا عصائے لا الہ داری بدست ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست ۴۵
ہر کہ در اقلیم لا آباد شد فارغ از بند زن و اولاد شد ۴۶
می کند از ماسویٰ قطعِ نظر می نہد سا طور بر خلق پسر ۴۷
نیابتِ الہی (ج)

نائبِ حق پہچو جانِ عالم است ہستی او ظلِ اسمِ اعظم است ۴۸
از رموزِ جزو و کل آگہ بود در جہاں قائم بامر اللہ بود ۴۹
نورِ انسان را بشیر و ہم نذیر ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر ۵۰
مدعائے علمِ الاسماستے مہرِ بسمان الذی امر استے ۵۱
ذاتِ او تجہیر ذاتِ عالم است از جلالِ او نجاتِ عالم است ۵۲

(۱۳) حیاتِ ملی کا تسلسل، روایاتِ ملیہ کی حفاظت و مدد و مست پر موقوف ہے۔ جو قوم اپنی ملی روایات سے بے خبر ہو جاتی ہے وہ صفحہ بہستی سے مٹ جاتی ہے۔ پس مسلمانوں کو اپنی ثقافتی روایات پر قائم رہنا چاہیے۔

اے امانت دارِ تہذیب کہن پشتِ پا بر مسلکِ آبا مزین^{۵۳}
(۱۴) مسلمان کی زندگی کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور جہاد کا مقصد اگر تسخیرِ ممالک ہو تو وہ اسلام میں حرام ہے۔

طبعِ مسلم از محبتِ قاہر است مسلم ارعاشق نباشد کافر است^{۵۴}
تابعِ حق دیدنش نا دیدنش خوردنش نوشیدنش خوابیدنش^{۵۵}
قربِ حق از ہر عمل مقصود دار تا تو گردد جلاش آشکار^{۵۶}
ہر کہ خنجر بہر غیر اللہ کشید تیغِ او بر سینہ او آرمید^{۵۷}
زندگی از طوفِ دیگر رستن است خولش را بیتِ الحرمِ دالسن است^{۵۸}
(۱۵) موجودہ عقل و فرد اور تہذیب در اہل جہالت اور سفاہت ہے مسلمانوں کو اس

مادی تمدن اور مغربی تہذیب سے بچنا چاہیے کیونکہ اس کی بنیاد غیر اللہ پر قائم ہے اور اس لیے کمزور ہے۔

علمِ مسلم کامل از سوزِ دل است معنی اسلام ترکِ آفل است^{۵۹}
سوزِ عشق از دالِش حاضرِ مجوے کیفِ حق از جامِ این کافرِ مجوئے^{۶۰}
دانشِ حاضرِ حجابِ اکبر است بتِ پرست و بتِ فروش و بتگرد است^{۶۱}
(۱۶) وقت (TIME) پر وہی شخص حکمران ہو سکتا ہے۔ جو اپنی خودی سے واقف ہو۔

چنانچہ مرشدِ رودنی کہتے ہیں۔

ہر کہ عاشق شد جمالِ ذاتِ را اوست سیدِ جملہ موجوداتِ رالہ^{۶۲}
امام شافعیؒ نے وقت کو سیفِ قاطع قرار دیا ہے۔ وقت در اہل حیات ہے اور کوئی

شخص حیات کو وقت سے جدا کر کے سمجھ بھی نہیں سکتا۔

من چہ گویم تیرایں شمشیرِ چہیت آب او سرمایہ دار از زند گیسٹ ۳۳
 پنجہ حیدر کہ خیبر گیر بود قوت او از ہمیں شمشیر بود ۳۴
 تو کہ از اصل زماں آگہ از حیات جاوداں آگہ ۳۵
 زندگی از دہر و دہرا زندگی است لا تلبو الدہر فرماں نبیؐ است ۳۶
 نغمہ خاموش دارد سازِ وقت غوطہ در دل زن کہ بینی رازِ وقت ۳۷
 (۱۷) آخر میں علامہ اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ:-

(ا) عشق را از شغل لا آگاہ کن آشنائے رمزِ اِلَّا اللہ کن ۳۸
 (ب) موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سینہ دل سے خالی ہے یعنی محلِ محبت ہے مگر لیلیٰ نہیں ہیں
 مثل شمع کے تنہا جل رہا ہوں کوئی میرا دلسوز نہیں۔ پس اے خدا یا تو یہ امانت مجھ سے واپس
 لے لے یا مجھے ایک ہم دم عطا کر۔

خواہم از لطف تو یارے ہمدے از رموزِ فطرت من محرمے ۳۹
 تا بجان او سپارم ہوتے خویش باز بینم در دل او روئے خویش ۴۰

ملتِ اسلامیہ کے نام اقبال کا پیغام

خلاۃً لہم لے خودی

جس طرح خودی کے معنی مجتہد یا غرور کے نہیں ہیں اسی طرح بے خودی کے معنی بے ہوشی یا خود فراموشی کے نہیں۔ بلکہ یہ فرد کی زندگی کی اس کیفیت کا نام ہے جو جماعت کے ساتھ وابستہ رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔

(۱) ربطِ فرد و ملت

علامہ فرماتے ہیں کہ فرد تنہا زندگی بسر کرنے کے لیے نہیں پیدا ہوا جہاں تک ہو سکے جماعت کے ساتھ رہنا چاہیے۔ چنانچہ آنحضرتؐ فرماتے ہیں ”شیطان جماعت سے دور رہتا ہے۔“

فرد می گیرد ز ملت احترام ملت از افراد می یابد نظام
فرد قوم سے جدا ہو کر اپنی ہستی کھو بیٹھتا ہے اور ترقی کی جگہ راہیں سدود ہو جاتی ہیں۔
ہر کہ آب از زمزم ملت نخورد شعلہ آتے نغمہ در عودش فرد
انسان کے اندر جو ہر فردی ہے۔ قوتِ ادراک اُسی کی ایک شعاع ہے۔ اس کی ترقی

جماعت میں رہ کر ہی ہو سکتی ہے۔

فطرتش آزاد وہم زنجیری است جزوِ اورا قوتِ کل گیری است
در جماعت خود شکن گردد خودی تاز گلبرگے چمن گردد خودی

(۲) ملت اختلاطِ افراد سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی تربیت کی تکمیل نبوت سے ہوتی ہے یعنی اللہ انبیاء کو اس لیے بھیجتا ہے کہ وہ مختلف انخیال افراد کو ایک سلک میں منسلک کر کے قوم بنادیتے ہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰؑ نے ایک قوم بنادیا اور عربوں کو سرکلمہ دینے نے

مخل انجم ز جذبِ باہم است ہستی کو کب ز کو کب محکم است ۵۱
نبی افراد کو یوں مخاطب کرتا ہے۔

گویش تو بسندہ دیگرہ زیں بتان بے زبان کتر پڑے
اس کے بعد انہیں ایک سلک میں منسلک کرتا ہے۔

تا سونے یک مدعایش می کشد حلقہ آئیں بپایش می کشد ۵۲
نکتہ توحید باز آموز دش رسم و آئین نیاز آموز دش ۵۳

(۳) ارکانِ اساسی (BASIC PRINCIPLES OF ISLAM)

(۱) اسلام کا رکنِ اول توحید ہے۔ یہ اسلام کا امتیازی نشان ہے۔ اور اسلام کا سارا فلسفہ اسی توحید میں مضمر ہے۔

عقلِ انسانی اسی توحید کی بدولت منزلِ مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ ورنہ اس بے چاری کو ساحلِ کہاں مل سکتا ہے؟ مومن میں دینِ حکمت، آئینِ زور و قوت اور تکمیلِ توحید کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جب سلمِ حقیقی معنی میں خدائے واحد کا پرستار ہو جاتا ہے تو کیا بتا ہے؟

بیم و شک میرِ ذمہ گیرِ حیات چشم می بسند ضمیرِ کائنات ۵۴
چوں مقامِ عبدہ محکم شود کاسہ در یوزہ جام جم شود ۵۵
ملتِ اسلامیہ کے لیے توحید بمنزلِ روحِ رواں ہے۔ اگر توحید کا تصور خارج کر دیا جائے تو ملتِ اسلامیہ لاشہ بے جان رہ جائے گی۔

ملت بیضاتن و جاں لا الا ساز مارا پردہ گرداں لا الا ۵۶
لا الا سرمایہ اسرار ما رشتہ اش شیرازہ افکار ما ۵۷

چونکہ اسلام کا خدا ایک ہے اس لیے ملتِ اسلامیہ کا مقصد بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔

ملت از یک رنگی دلہا ستے روشن از یک جلوہ ایں سینا ستے ۵۸
قوم را اندیشہ باید یکے در ضمیرش مدعا باید یکے ۵۹

مسلمان کو حسب و نسب پر نازاں نہیں ہونا چاہیے اِنْ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ

بر حسب نازاں شدن نادانی است حکم او اندر تن و تن فانی است^{۸۵}

ملت مارا اساس دیگر است اس اساس اندر دل ماضی است^{۸۶}

ماز نعمت ہاتے او اخوان شمیم یک زبان و یک دل و یک حال شمیم^{۸۷}

(۳) ب: یاس و حزن و خوف اُمّ الخباثت ہیں اور حیات کے دشمن ہیں توحید پر اگر کامل ایمان ہو تو ان امراض کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ انسان کو لازم ہے کہ کبھی ناامید نہ ہو کیونکہ ناامیدی حیات کے لیے سامانِ مرگ ہے اسی لیے اللہ فرماتا ہے لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ۔

اے کہ در زندانِ غم باشی اہیر از بنی تعلیم لا تخزن بجزیر^{۸۸}

قوتِ ایماں حیاتِ افزاید ورد لا خوف علیہم بایست^{۸۹}

بیم غیر اللہ عمل را دشمن است کاروانِ زندگی را رہزن است^{۹۰}

ہر خبرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست اصل او بیم است اگر بینی درست^{۹۱}

ہر کہ رمزِ مصطفیٰ فہمیدہ است شرک را در خوف مضمر دیدہ است^{۹۲}

خوفِ حق عنوانِ ایمان است و بس خوفِ غیر از شرکِ پنہان است و بس^{۹۳}

(۴) رکنِ دوم رسالت: جس چیز کی توحید کے بعد ضرورت ہے وہ ایمان بر رسالت ہے۔

رسالت پر ایمان لانے سے تو مردہ میں جان آجاتی ہے اور دین و آئین کی بنیاد رسالت ہی

ہے۔ رسولِ اسلام کے قلب و جگر کی قوت ہوتا ہے اور خدا سے بھی زیادہ پیارا ہوتا ہے کیونکہ

وہ ہمیں خدا تک پہنچاتا ہے۔ اس کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینا مسلمان کے لیے موت کا حکم رکھتا ہے

سرکارِ مدینہ نے ہمیں دینِ حق اور مذہبِ فطرت عطا کیا اور اس لیے کہ ہماری وحدت

میں کوئی تفرقہ پیدا نہ ہو اور ہماری ہستی ابدی ہو جائے۔ خدا نے ہمارے رسول پر رسالت تم کو دی

قوتِ قلب و جگر گردد نبی از خدا محبوب تر گردد نبی^{۹۴}

دینِ فطرت از نبی آموختیم در رو حق مشعل افروختیم^{۹۵}

لَا يَنْبَغِي بَعْدِي زَا حَسَنَ خَلَاةٍ ۚ ۹۶
 پر وہ ناموس دین مصطفیٰ است

(۴) ب: رسالت محمدیؐ کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں انسانوں کے اندر حریت و اخوت و مساوات قائم ہو جائے۔

آنحضرتؐ کی بعثت سے پہلے انسان انسان پرست تھا۔ آنحضرتؐ نے دنیا کو حریت و اخوت و مساوات کا سبق پڑھایا۔

كُلُّ مُؤْمِنٍ اِخْوَةٌ اَنْدَرْدَش ۚ ۹۷
 حریت سرمایہ آب و گلش

ناشکبہ امتیازات آمدہ ۚ ۹۸
 در نہاد او مساوات آمدہ

اس کے بعد علامہ نے تاریخ اسلامی سے ان تینوں کی مثالیں دی ہیں حریت کی مثال میں امام حسینؑ کی شہادت پیش کی ہے۔

بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است ۚ ۹۹
 پس بنائے لا الہ گردیدہ است

ما سو اللہ را مسلمان بندہ نیست ۚ
 پیش فرعون نے سرش اگندہ نیست

رمز قرآن از حسینؑ آموختیم ۚ
 ز آتش او شعلہ ہا اندوختیم

رمز قرآن سے علامہ کی مراد یہ ہے کہ مسلمان کو ہر حال میں باطل کا مقابلہ کرنا چاہیے اور اگر ضرورت پڑے تو جان دینے سے دریغ نہ کرنا چاہیے۔

(۵) چونکہ ملت محمدیؐ کی بنیاد توحید اور رسالت پر ہے اور یہ تھاق محدود فی المکان نہیں

ہیں اس لیے ملت محمدیؐ بھی محدود فی المکان نہیں۔ اس لیے:

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا ۚ
 مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

مسلم استی دل با قلمیہ مبند ۚ
 گم مشو اندر جہان چون و چند

دل بدست آور کہ در پہنائے دل ۚ
 می شود گم ایں سرانے آب و گل

آنحضرتؐ نے اپنے وطن سے ہجرت کر کے مسلم کی قومیت کا عقدہ حل کر دیا۔ مدینہ

کو وطن بنا لیا جو آپؐ کا جائے ولادت نہیں تھا۔ یعنی تمام دنیا مسلمان کا وطن ہے اور تمام زمین

اس کے لیے مجھ ہے۔

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است این ز اسبابِ ثباتِ مسلم است
صورتِ مہمی بہ بحرِ آباد شو یعنی از قیدِ مقامِ آزاد شو
ہر کہ از قیدِ جہاتِ آزاد شد چون فلکِ درخشِ جہتِ آباد شد

(۶) وطن اساسِ ملت نہیں ہے۔ وطنیت کے عقیدہ کو علامہ مسلمان قوم کے لیے از بس مضر خیال کرتے ہیں کیونکہ اس کی بنا پر اخوت کا زیرِ اصول تباہ ہو جاتا ہے جو لوگ ملت کی تعمیر و وطنیت کے اصولوں پر کرتے ہیں وہ نوعِ انسان کے ساتھ دشمنی کرتے ہیں۔ دنیا میں جو کچھ ہنگامہ سچا ہے اور ایک قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی نظر آتی ہے وہ اسی وجہ سے ہے۔ اساسِ ملت وطن نہیں بلکہ مذہب ہے۔

تأسیست مسندِ مذہب گرفت این شجر در گلشنِ مغرب گرفت
روح از تن رفت و ہفت اندامند آدمیت گم شد و اقوام ماند
(۷) جس طرح ملتِ محمدیؐ محدود فی المکان نہیں اسی طرح مقتیدہ بالزمان بھی نہیں۔ اگرچہ فرد و ملت کی اجل مقرر ہے اور ملت بھی فرد کی طرح مردہ ہو جاتی ہے۔ لیکن ملتِ محمدیؐ اجل سے محفوظ ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے اس ملت کی بقا کا خود وعدہ فرمایا ہے۔

امتِ مسلم ز آیاتِ خداست اصلش از ہنگامہ قائلوا بلی است
از اجل این قوم بے پروا ہے استوار از سخنِ نزول سے
تا خدا اَنْ یَقْضِیَ اَمْرُہُ است از فردن این چراغِ آسودہ است
(۸) نظامِ ملت کسی ضابطہ کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا اور اس لیے خدا نے نظامِ ملت کے قیام و ثبات کے لیے قرآنِ پاک نازل فرمایا ہے پس اگر مسلمان اپنا ملی نظام استوار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں قرآن کو اپنا دستورِ حیات اور ضابطہ عمل بنانا چاہیے۔

ہستیِ مسلم ز آئینِ است و بس باطنِ دینِ نبیؐ این است و بس

اَلْکِتَابُ زَیْدٌ مُسَدَّنٌ حَکِیْمٌ حَکْمَتِیْ اَوْ لَا یَزَالُ اسْتُ و قدیم^{۱۱۳}
 حرفِ اورا ریب نے تبدیل نے آیہ اشش شرمندہ تاویل نے^{۱۱۴}
 نوریٰ انساں راہِ پیغم آفریں حاملِ اور رحمۃ للعالمین^{۱۱۵}

اس کے بعد علامہ نے علمِ سستِ پیام سے خطاب کیا ہے اور دو لفظوں میں رازِ حیات بیان کر دیا ہے۔

اے گرفتارِ رسومِ ایمانِ تو شیوہ ہائے کافری زندانِ تو^{۱۱۶}
 قطعِ کردی امرِ خود را در زُبُرِ جادۂ پیمائیِ اِلٰی شئیءِ مُنْجَرُکِ^{۱۱۷}
 گر تو می خواہی مسلمان زبیتن نیست ممکن جز بقراں زبیتن^{۱۱۸}

(۹) انخطاط کے زمانہ میں تقلید کرنا اجتہاد کرنے سے زیادہ مفید ہے۔ یہاں تقلید کے معنی فقہی نہیں ہیں بلکہ روایاتِ ملی پر عمل ہونے کے ہیں۔ علامہ ایک جگہ فرماتے ہیں:
 اگر تقلید بودے شیوۂ نیک ہمیر ہم رو اجداد رفتے^{۱۱۹}
 یعنی تقلید کو بڑا بتایا ہے۔ اس جگہ تقلید کو اجتہاد سے ادنیٰ تر قرار دیا ہے پس معلوم ہوا کہ وہاں تقلید کے معنی کو رانہ پیروی کے ہیں اور یہاں تقلید کے معنی اپنی ثقافتی روایات (CULTURAL TRADITIONS) ملی کی حفاظت اور ان پر عمل کرنا ہیں۔ لکھتے ہیں:-

راہِ آبا رو کہ ایں جمعیت است معنی: تقلید ضبطِ ملت است^{۱۲۰}
 اس شعر میں خود بھی تقلید کے معنی صاف کر دیئے ہیں۔

نقشِ بردل معنیٰ تو حید کن چارۂ کارِ خود از تقلید کن^{۱۲۱}
 اجتہاد اندر زبانِ انحطاط قوم را برہم ہی پیچد بساط^{۱۲۲}
 ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر اقتدا بر رنگاں محفوظ تر^{۱۲۳}
 از یک آئینی مسلمان زندہ است پیکرِ ملت ز قراں زندہ است^{۱۲۴}
 ماہرِ خاک و دلِ آگاہ اوست اعتصامش کن کہ جل اللہ اوست^{۱۲۵}

الغرض تقلید کے معنی میں قرآنی احکام کی بے چون و چرا تعمیل کرنا اور یک آئینی کو اپنا نصب العین بنانا سنت نبویؐ پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہنا اور ہر معاملہ میں قرآن سے فیصلہ طلب کرنا۔
 (۱۰) اتباعِ آئینِ الہیہ سے سیرتِ ملی میں کھٹکی پیدا ہوتی ہے۔ یہ عنوان حمزہ جاں بنانے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں کہ قرآن وہ ہیرا ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے تراشا ہے۔ اس میں سراسر نور اور روشنی ہے اس کا ظاہر بھی موتی ہے اور باطن بھی موتی ہے۔ اس کا ظاہر و باطن دونوں ایک ہے۔ علمِ حقیقت شریعت سے جدا نہیں ہے اور سنت کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرتؐ سے محبت کی جائے۔ ہر کہ عشقِ مصطفیٰؐ الخ اگر مسلمان اپنے ایمان کو مضبوط اور شاداب رکھنا چاہتے ہیں تو اتباعِ شریعت کریں۔ ملت کا نظام اتباعِ شریعت پر مبنی ہے۔ جب یہ نظام محکم ہو جاتا ہے تو ملت کو دوام نصیب ہو جاتا ہے۔ لوگ اسلام کا "راز" (SECRET) پوچھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ شریعت ہی اسلام کا راز ہے۔

اگر کوئی قوتِ اتباعِ شریعت میں مزاحم ہو تو اس کا مقابلہ کرنا فرض ہے۔
 ہر ایں فرمانِ حقِ دانی کہ چسیت زلیتن اندر خطرا زند گیسٹ
 آنحضرت صلم کا دینِ زندگی بخشے والا دین ہے۔

ہست دینِ مصطفیٰؐ دینِ حیات شرعِ او تفسیرِ آئینِ حیات
 جب سے مسلمانوں نے شعارِ نبویؐ سے روگردانی کی رُمزِ بقا سے محروم ہو گئے۔
 تا شعارِ مصطفیٰؐ از دست رفت قوم را رُمزِ بقا از دست رفت
 آفریں نصیحت کی ہے کہ عجبی خیالات سے پرہیز کرو کیونکہ وہ حدودِ اسلام سے تجاوز کرنا سکھاتے ہیں۔ عرب سے الفت پیدا کرنا چاہیے۔

با مریدے گفت اے جانِ پدر از خیالاتِ عجم باید حذر
 زانکہ فکرش گر چہ از گردوں گزشت از حدِ دینِ نبیؐ بیرون گزشت
 قلب را زین حرفِ حقِ گردانی نمی با عرب در ساز تا مسلم شوی

(۱۱) سیرت قومی میں اتباع رسولؐ سے حسن و خوبی پیدا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مرشد رومیؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:-

مگل از ختم الرسلؐ ایام خویش بکھیکم کن برفن و برگام خویش^{۱۳۲}
مسلمانوں کے لیے حضرت ختمی مرتبتؐ کی ذات ستودہ صفات بہترین نمونہ ہے۔
اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو رہنا بنانا کارنا دانی ہے۔

غنیچہ از شاخارِ مصطفیٰ گل شو از بادِ بہارِ مصطفیٰ^{۱۳۳}
از بہارِش رنگ و بو باید گرفت بہرہ از خلق او باید گرفت^{۱۳۴}
آنکو جہتاب از سرگشتش دو نیم رحمت او عام و اخلاقش عظیم^{۱۳۵}
از مقام او اگر دور ایستی از میانِ معشر ما نیستی^{۱۳۶}

(۱۲) حیات ملیہ کے لیے ایک مرکز محسوس بھی اشد ضروری ہے اور مسلمانوں کا مرکزیت تو رہے۔ بس مسلمانوں کو اس سرزمین کو اپنا مرکز یقین کرنا چاہیے۔ مگر واقعی ہمارا کعبہ مقصود ہے اور جسے مکہ سے محبت نہیں اس کے ایمان میں خلل ہے جو جماعت مکہ کو چھوڑ کر کسی اور سرزمین کو اپنا مرکز قرار دے وہ اسلام سے خارج ہے۔

ہم چننا آئینِ میلادِ اہم زندگی بر مرکزے آید بہم^{۱۳۷}
قوم را ربط و نظام از مرکزے روزگارش را دوام از مرکزے^{۱۳۸}
رازدار و راز ما بیت الاحرام سوز ما ہم ساز ما بیت الاحرام^{۱۳۹}
در جہاں مارا بلند آوازہ کرد با حدوث ما قدم شیرازہ کرد^{۱۴۰}

(۱۳) تنظیم حقیقی کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ افراد ملت کے سامنے کوئی نصب العین ہو اور ہر فرد اس کے حصول میں منہمک ہو اور امت محمدیؐ کا نصب العین یہ ہے کہ توحید کی حفاظت اور اشاعت کی جائے گویا ہر مسلمان مبلغ اسلام ہے۔

دعا رازِ بقائے زندگی جمع سیما پِ قوائے زندگی^{۱۴۱}

چوں حیات از مقصدِ محرم شود ضابطِ اسبابِ ایں عالم شود ^{۱۳۲}
 بچو جان مقصودِ پنہاں در عمل کیفیت و کم ازوے پذیرد ہر عمل ^{۱۳۳}
 زانکہ در تکبیر رازِ بودِ تست حفظ و نشر لا الا مقصودِ تست ^{۱۳۴}
 تازخیزد بانگِ حق از عالمے گر مسلمانی نیا سائی دے ^{۱۳۵}

اجکل جبکہ اتحاد اور مادیت کا زور ہے قرآنی تعلیمات کی اشاعت از بس ضروری ہے۔ موجودہ مشکلات کا حل اس کتاب میں موجود ہے۔ پس مسلمانوں کو یکسر تبلیغ و اشاعتِ اسلام میں مہمک ہو جانا چاہیے۔

(۱۴) حیاتِ ملی میں فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے سے وسعت پیدا ہو سکتی ہے۔ عہدِ ہنسی میں مسلمانوں کا یہی شعار تھا۔ لیکن اب علوم و فنون سے بے بہرہ ہیں تحقیق و اجتہاد کو کفر سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی و درکار منزل کر رہے ہیں۔

ما سوا از ہر تسخیر است و بس سینہ او عرضہ تیر است و بس ^{۱۳۶}
 غنچہ از خود چمن تعبیر کن شبنمی و خورشید را تسخیر کن ^{۱۳۷}
 خیزو واکن دیدہ محسور را دول نخواست ایں عالم مجبور را ^{۱۳۸}
 غایتش توسیع ذاتِ سلم است امتحانِ ممکناتِ سلم است ^{۱۳۹}
 حق جہاں را قسمت نیکال شمرد جلوہ اشش با دیدہ مومن سپرد ^{۱۴۰}
 تو کہ مقصودِ خطابِ انظری پس چرا ایں راہ چوں کدیاں بری ^{۱۴۱}
 علم آسا اعتبارِ آدم است حکمتِ اشیاء حصارِ آدم است ^{۱۴۲}

(۱۵) حیاتِ ملیہ کا کمال یہ ہے کہ ملت میں بھی فرد کی طرح اپنی خودی کا احساس پیدا ہو۔

جائے اور اس احساس کی تولید و تکمیل اپنی ملی روایات (CULTURAL TRADITIONS) کی حفاظت اور اشاعت سے ممکن ہے۔

ملت میں خودی کے احساس کے معنی یہ ہیں کہ ہر فرد اپنی جگہ بہبودِ ملت کا ذمہ دار ہو۔

اگر زیادہ تکلیف پہنچے تو تمام جماعت اس تکلیف کو محسوس کرے۔ اس کا نظارہ دہلی نے ۱۸۵۷ء میں دیکھا تھا جبکہ بارہ سپاہیوں اور ان کے افسر نے بخوشی میگزین میں آگ لگا دی اور خود بھی اس میں جل کر مر گئے تاکہ دوبارہ دہلی کے دشمن ان کے بھائیوں کے خلاف استعمال نہ کر سکیں۔ وہ بظاہر مر گئے لیکن باطن زندہ ہیں اور لاڈلو لنگدن سرسبز برٹ ایمرن اور دوسرے گورنران ضوابط کی شکل میں آج ۱۹۳۳ء میں ہندوستان پر حکومت کر رہے ہیں۔ جب تک مسلمانوں میں یہ احساس پیدا نہ ہو ان کا ابھڑنا اور ترقی کرنا معلوم۔ فی الحال تو یہ کیفیت ہے کہ ہندو سے زیادہ مسلمان مسلمان کا دشمن ہے۔ میونسپل کمیٹی اور کونسل سب جگہ منافرت اور منافقت کا بازار گرم ہے۔ (واضح رہے کہ یہ تحریر ۱۹۳۳ء کی ہے: مدیر)

اس احساس کو پیدا کرنے کے لیے تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنا اور اپنی روایات ملی کی حفاظت کرنا ضروری ہے۔ زندہ اقوام اپنی روایات کی بہت حفاظت کرتی ہیں اور بچوں کے قلوب میں ان روایات کا نقش قائم کرتی ہیں لیکن ہندوستان میں ہماری تعلیم انگریزوں کے ہاتھ میں ہے اور انہیں کلرکوں کی ضرورت ہے نہ کہ قومی درد رکھنے والوں کی۔

طفل میں بو آئے کیا ماں باپ کے اطوار کی

دودھ ہے دے گا اور تعلیم ہے سرکار کی

ربط ایام است مارا پیرمین سوزنش حفظ روایات کہیں ۱۵۳
چیت تاریخ اے ز خود بگاز داستانے قصہ افسانہ ۱۵۴
ایں ترا از خویشن آگر کند آشنائے کار و مردہ کند ۱۵۵
مشکن از خواہی حیات لازوال رشتہ ماضی ز استقبال وصال ۱۵۶

(۱۶) بقائے نوع امومت (MOTHERHOOD) پر منبصر ہے اس لیے اسلام میں

امومت کے احترام کو فرض عین قرار دیا گیا ہے۔

اسلام نے "عورت" کو بڑا بلند درجہ عنایت کیا ہے کیونکہ عورت مرد کے لیے باعث

تسکین اور کائنات کے لیے موجب رونق ہے۔ مرد میں عورت ہی کی وجہ سے نغمہ پیدا ہوتا ہے بلکہ مرد کے لیے موجب زینت و آسائش ہے اسی لیے آنحضرت صلعم نے خوشبو اور نماز کے ساتھ اس کا ذکر بھی فرمایا۔

جو مسلمان عورت کو اپنا خادم یا ماتحت خیال کرتا ہے وہ فہم قرآن سے محروم ہے کیونکہ میں
 ائمہ نازد بروجد کش کائنات ذکر او فرمود باطیب و صلوة ۱۵۷
 مسلمے کو را پرستارے شرد بہرہ از حکمت قرآن برد ۱۵۸
 نیک اگر مینی امومت حمت است زانکہ او را بانہوت نسبت است ۱۵۹
 شفقت او شفقت پیغمبر است سیرت اقوام را صورت گر است ۱۶۰
 گفت آن مقصود حرف کن نکلا زیر پائے اقبات آد جبال ۱۶۱
 ملت از تحکیم احرام است لب ورنہ کار زندگی خام است و لب ۱۶۲
 حافظ رمز اخوت مادران قوت قرآن و ملت مادران ۱۶۳
 عورتوں کے لیے سیدۃ النساء خاتمۃ الزہراءؑ اسوۂ حسنہ ہیں۔

(۱۷)

مزرع تسلیم را حاصل بتو مادران را اسوۂ کامل بتو ۱۶۴
 آل ادب پروردہ صبر و رضا آسما گردان و لب قرآن سرا ۱۶۵

(۱۸) خطاب بر مختارات اسلام علامہ مسلمان عورتوں سے خطاب فرماتے ہیں کہ دران اسلام کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو سب سے پہلے اسلام اور اسلامی روایات سے آگاہ کریں اور اپنے فرض کو پہچانیں۔ وہ ذمہ دار ہیں اور بچوں کی سیرت انہی کے سانچے میں ڈھلتی ہے۔

موجودہ زمانہ بڑا پر آشوب ہے کفر و الحاد کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ ماؤں کو چاہیے کہ مسلمان بچوں کو قرآنی تعلیمات سے مسلح کر کے کارزارِ عالم میں بھیجیں۔
 ۱۶۶
 کو دک ماچوں لب از شیر توشت لا الا آموختی اور انخت

می ترا شد مہر تو اطوارِ ما، گفتارِ ما، کردارِ ما ^{۱۴۶}
 دورِ حاضر تر فروش و پرفتن است کار وانش نقدِ دین را رهن است ^{۱۴۸}
 کور و یزدان ناشناس اوراکِ او ناکساں زنجیری پیچاکِ او ^{۱۴۹}
 ہوشیار از دستبردِ رونگار گیر فرزندِ این خود را در کف ^{۱۵۰}

(۱۹) آخر میں علامہ نے سورۃ اخلاص کی تفسیر اپنے مخصوص رنگ میں لکھی ہے۔ میں اس کا خلاصہ بھی طوطیا نے چشم بناتا ہوں۔

علامہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک رات حضرت صدیق اکبرؓ کو خواب میں دیکھا تو اُن سے کہا کہ اُمتِ معرورہ کی بہبود کی کوئی صورت بتائیے انہوں نے جواب دیا کہ مسلمانوں کو سورۃ اخلاص سے آب و تاب حاصل کرنی چاہیے۔

توحید کا رنگ پیدا کر لو سارے عقدے حل ہو جائیں گے۔

بایکی ساز از دوئی بردار رخت وحدتِ خود را مگر داں لخت لخت ^{۱۵۱}
 خدا نے مسلمانوں کو ایک قوم بنایا وہ اب ترک، افغان اور ہندی بنے ہوئے ہیں۔
 قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ کے معنی زبان سے ادا کرنے سے کام نہیں بنتا، جب تک مسلمان وحدت کا رنگ اپنے اندر نہ پیدا کریں۔ جس طرح اُن کا خدا ایک ہے اسی طرح انہیں بھی ایک ہونا چاہیے۔
 یک شو توحید را مشہود کن غائبش را از عمل موجود کن ^{۱۵۲}
 لذتِ ایساں فزاید در عمل مژدہ آں ایماں کہ ناپہ در عمل ^{۱۵۳}
 (ب) اَللّٰهُ اَحَدٌ کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ صد ہے تم بھی غیر اللہ سے بے نیاز ہو جاؤ۔
 اور صرف اللہ کو کعبۂ مقصود بنا لو۔

بندۂ حق بندۂ اسباب نیست زندگانی گردشِ دو لاب نیست ^{۱۵۴}
 مسلم استی بے نیاز از غیر شو اہلِ عالم را سراپا خیر شو ^{۱۵۵}
 راہ دشوار است سماں کم گیر در جہاں آزاد زنی آزاد میر ^{۱۵۶}

پشتِ پازن تختِ کیکاؤس را ^{۱۷۷} سربرده از کفِ مدہ ناموس را
 بے نیازی رنگِ حق پوشیدن است ^{۱۷۸} رنگِ غیر از پیرہنِ شوتیدن است
 آفتابِ استی یکے در خود نگر ^{۱۷۹} از نجومِ دیگران تا بے محسّر
 تا بحجا طوفِ چراغِ محفلے ^{۱۸۰} ز آتشِ خود سوز اگر داری دلے

(ج) جس طرح اللہ تم لَمَلِیْدَ وَلَمَلِیْدُ لَدَبَ اسی طرح مُلَم رنگِ دغون سے
 بالاتر ہے۔ اسلام میں حب و نسب، رنگ، قوم، ذاتِ پات، نسل، زبان، دولتِ ثروت
 یہ سب بیچ ہیں۔

فارغ از اتم و اب و اعمام باش ^{۱۸۱} بچو سلمان زاده اسلام باش
 گرنسب را جزو ملت کردہ ^{۱۸۲} رخنہ در کارِ اخوت کردہ
 دل بہ محبوبِ حجازی بستہ ایم ^{۱۸۳} زیں جہتِ بایک دگر پیوستہ ایم
 رشتہ مایک تولایش بس است ^{۱۸۴} چشم مارا کیفِ صہبایش بس است
 عشق در جان و نسب در پیکر است ^{۱۸۵} رشتہ عشق از نسب محکم تر است
 ہر کہ پا در بندِ اقلیم و جد است ^{۱۸۶} بے خبر از لَمَلِیْدَ لَمَلِیْدَ است

(د) وَلَمَلِیْکُنْ لَہُ کَفْوًا اَحَدٌ کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح کوئی اللہ کا
 ہمسر نہیں، کوئی قوم مسلمانوں کی بھی ہمسر نہیں۔

رشتہ بآلَمَلِیْکُنْ باید قومی ^{۱۸۷} تا تو در اقوام بے بہت شوی
 آئیکہ ذاتش واحد است ولا شریک ^{۱۸۸} بندہ اش ہم در نازد با شریک
 خرو لا تخرؤا اندر بر شش ^{۱۸۹} اُنتم اَلَا عَلَوْنَ تا جے بر سر شش
 پیشِ باطل تیغ و پیشِ حق سپر ^{۱۹۰} امر و نہی او عیارِ خیر و شر
 خوار از مہجوریِ قرآن شدی ^{۱۹۱} شکوہ سنج گردشِ دُورِاں شدی
 اے چو شبنم بر زمیں افستندہ ^{۱۹۲} در بغلِ داری کتابِ زندہ

(۲۰) عرضِ حالِ مصنف بحضورِ رحۃِ تلعالمین

اس آخری باب میں علامہ نے سرکارِ مدینہ سے عرض کی ہے کہ حضورِ اہلسان سُبْرَبی سے بیگانہ ہو گیا ہے اُس نے اب سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا ہے اور عجمی خیالات عجمی تمدن اور عجمی وضع اختیار کر لی ہے۔ میں نے اُسے قرآن کی طرف بلایا ہے۔

مَحَلُّ از شَمِیعِ نَوَا اَفْرُوسْتَم قوم را رَمِزِ حَیَا تِ اَنُوسْتَم^{۱۹۳}
لیکن اگر میں نے قرآن کے علاوہ کسی اور شے کی طرف بلایا ہے تو بے شک آپ مجھے جو مرضی ہو سزا دیں۔

گَر دَلَمِ آتِیَسْذِ بے جوہر است و در بحرِ فَمِ غَیْرِ قُرْآنِ مَضْمُرِ اسْتِ^{۱۹۴}
پَرْدَہِ نَامُوسِ فُحْمِ چاک کن ایں خیاباں را ز خارِ مِ پاک کن^{۱۹۵}
رَوِزِ مَحْشَرِ خَوَارِ و سَوَا کن مرا بے نصیب از بوسۂ پاکِ مَرَا^{۱۹۶}
اور اگر میں نے قرآن ہی کی طرف بلایا ہے تو پھر اتنی درخواست ہے۔

عَرْضِ کن پیشِ خَدائے عَزَّوَجَلَّ عَشْقِ مَن گَر دَدِہِمِ اَغُوشِ عَمَلِ^{۱۹۷}
سب سے آخر میں علامہ نے سرکارِ مدینہ کے سامنے بڑے ادب کے ساتھ اپنی ایک دلی آرزو پیش کی ہے:

زَندَگی را از عَمَلِ سَااں نَبود پس مرا ایں آرزُو شایاں نَبود^{۱۹۸}
بَستِ شَاہِ رَحْمَتِ گِیسی نَوَاز آرزُو دارم کہ میرم در حِجَازِ^{۱۹۹}
از دَرْتِ خِیَزَد اگر اَجْزائے مَن وائے اَمْرُوزِ مَخْشَا فَرْدِ اَتے مَن^{۲۰۰}
کُوکُم را دِیدَہِ بَیْدَارِ بَخْشِ مَرْدے در سَیَّہِ دِلَوَارِ بَخْشِ^{۲۰۱}
علامہ کی یہ دعا اس قدر رقت آمیز ہے کہ کوئی صاحبِ دل بغیر چشمِ ترکیے اُسے ختم نہیں کر سکتا۔

خدا کرے علامہ کی یہ دعا قبول ہو اور علامہ کے علاوہ دیگر عاشقانِ رسول کو بھی یہ عبادِ نصیب ہو۔ آمین
(’مِثاق‘ جولائی و اگست ۱۹۶۹ء)

حواشی

فیہ راقم الحروف نے دوران قیام سیالکوٹ میں علامہ موصوف کے والد بزرگوار شیخ نور محمد صاحب سے شرف ملاقات حاصل کیا تھا۔ تقریباً بیس ملاقات یوں ہوئی کہ میں نے ایک دن اپنے محرم و محترم مولوی احمد دین صاحب مرحوم دو والد بزرگوار حضرت اثر صبیانی مرحوم سے عرض کی کہ میں والد علامہ اقبال، مولانا میر حسن اور علامہ عبدالحکیم مرحوم سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ فرمانے لگے میرے ساتھ چلو ان سب سے ملا دوں گا۔ چنانچہ ان کی محبت میں علامہ موصوف کے والد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اتوار کے دن، کوئی گیارہ کاغزل ہو گا، ہم دونوں پیدل روانہ ہو کر اس بزرگ کی خدمت میں پہنچے۔ شیخ صاحب موصوف کی عمر سب سے بڑی ۹۲۸ء میں اسی اور نوے کے درمیان ہوگی۔ ۸۵ سے بہر حال کم نہ تھی۔ بصارت اور سماعت دونوں میں فرق آگیا تھا۔ مولوی صاحب نے مجھے متعارف کیا۔ میں نے کہا مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آج میں نے اس شخص کو دیکھا، جس کے گھر اقبال جیسا بلند اقبال پیدا ہوا جس نے اسطو اور افلاطون کی صف میں اپنے لیے جگہ بنائی ہے جو فلسفہ مغرب کا ماہر ہونے کے باوجود نبی اُمّی کا شیدائی ہے جس کے نزدیک کلام اور رفعت و تعجیل نے شرق اور مغرب دونوں سے خارج و بین و حول کیا ہے۔ فرمانے لگے "یہ اللہ کا فضل ہے۔ ذلک فضل اللہ انج" پھر مجھے تھو دیا میں نے ان کی نظر سے دوچار کرش لگائے۔ مولوی صاحب سے معلوم ہوا کہ شیخ صاحب نہایت ذہین اور طباع انسان تھے۔ جوانی میں ان کی دکان سیالکوٹ کے شرفاؤں زندہ دل لوگوں کا مرکز تھی۔ وہ سرسبز کے بڑے حامی تھے اور اگرچہ تعلیم پر اتنے نام نہاد تھے لیکن علمی اور مذہبی مسائل پر گفتگو کرتے تو کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کوئی عامی یا کم سواد انسان ہے۔ صورت ڈاکٹر اقبال سے بہت ملتی تھی۔ رنگ جوانی میں شہاب ہو گا اس عمر میں بھی رخساروں پر مرضی باقی تھی معلومات عامہ کا چکا چڑا ہوا کتب چھوڑتا ہے۔ دوسروں سے اخبار پڑھ کر سنتے تھے۔ حق و نفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ ۱۹۲۹ء میں وفات پائی۔

میں نے مولانا کو سب سے بڑی ۹۲۸ء میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا اس وقت ان کی عمر غالباً نوے سال کی ہوگی بصلہ سے محروم ہو چکے تھے لیکن بصیرت کافی حاصل تھی۔ صوم و صلوة کی پابندی جوانوں کو درس عبرت دیتی تھی۔ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ بلا مبالغہ ہزاروں اشعار اردو، فارسی اور عربی کے ٹوک زبان تھے میں نے نظیری کا ایک شعر پڑھا اور اس کے معانی دریافت کیے۔ فرمایا آپ تو ماشار اللہ فارسی میں خاصی تبت رکھتے ہیں۔ اس شعر میں ٹوکوتی خاص بات نہیں۔ میں نے عرض کی کہ مقصود یہ ہے کہ شاعر دی کا مثر

حاصل ہو جائے۔ آپ اقبال کے استاد ہیں جس کی شاگردی کے لائق بھی میں نہیں ہوں۔ پس اگر آپ سے نسبت حاصل ہو جائے تو فخر و مباہات کا ایک پہلو بیٹھے بٹھائے ہاتھ لگ جائے گا اور میں ہم چٹوں میں یہ کہہ سکوں گا۔

گرچہ غور و خردیم نسبتے است بزرگ ذرۂ آفتاب تا بانیم
میری گفتگو سے قدرے محظوظ ہوئے اور فرمانے لگے میاں ہیں بھی استادوں کی صحبت سے فیض حاصل کرنے کا چمکا تھا۔ ۱۸۹۲ء میں یہی شوق کشاں کشاں غالب کی خدمت میں دلی لے گیا تھا۔ اس وقت سیالکوٹ میں ریل نہیں آئی تھی اس لیے وطن سے انبالہ تک گھوڑے پر سفر کیا تھا بعض موقعوں پر پیدل بھی چلنا پڑا مگر شوق نے ساری منزلیں طے کرادیں۔

مولانا کی دینداری اور علمیت کا حال بیان کر چکا۔ ایک واقعہ اور بیان کرتا ہوں۔ جوانی میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا جب تک پیدل چلنے کی طاقت باقی رہی روزانہ بلانا نامہ اپنی والدہ کی قبر پر چلتے رہے۔ ایک سپارہ جاتے اور ایک آتے ختم کرتے تھے۔ یہ سلسلہ ۵۶ سال تک جاری رہا۔ اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں یہ ۱۹۲۹ء میں وفات پائی۔

ڈاکٹر سرمائی، ڈبلیو۔ آر لنڈ، سی آئی ای، ڈی سی، ایم اے ۱۸۸۵ء میں علی گڑھ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہو کر آتے تھے۔ عجیب علم دوست اور ذہین فطین اور بالغ نظر انسان تھا۔ عربی اور اسلامیات سے بہت دلچسپی تھی اور راسخ العقیدہ عیسائی ہونے کے باوجود اسلام اور مسلمانوں سے نفرت نہیں تھی۔ تعصب نام کو نہ تھا۔ دعوت اسلام جس کا ترجمہ سرسید کے ایما سے شیخ عنایت اللہ خلف شمس العلما خان بہادر منشی ذکار اللہ دہلوی لے گیا تھا ایسی کتاب ہے جو دراصل ہمارے علماء کو کھنی چلیتی تھی لیکن بقول علامہ شبلی ہمارے علماء اس کے کہیں زیادہ اہم کاموں میں مصروف ہیں۔ مثلاً تحفیر اہل قبلہ ہند متنازع نظیر ہند اسکا ان کذب، استنجا بالماء اور بالماء، طہت غراب، فاتحہ خلف الامام، امین بالجہر، رفع یدین، قیام در میلاد، صلوة قبل المنبر، جواز شیشائند، انہدام قباب، تقبیل الالہامین، استمداد عن القبر، احضار صورت محمدی، ایصال ثواب وغیرہ۔

اس کتاب سے ان کے تجربہ علمی، وصحت معلومات اور اعلیٰ قابلیت کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ غالباً ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ سے لاہور آئے۔ یہاں انہوں نے تفسیر کبیر کے اقتباسات سے محترمہ کے عقائد پر ایک رسالہ عربی زبان میں تالیف کیا تھا۔ جو یوزک نے لندن سے ۱۹۰۲ء میں شائع کیا تھا۔ میں نے یہ رسالہ ۱۹۲۵ء میں پڑھا تھا۔ چونکہ علم دوست تھے اس لیے انہیں علامہ اقبال

سے خاص انیت ہوگئی تھی اور علامہ کو بھی اُن سے بڑی محنت تھی چنانچہ انہوں نے ایک نظم بھی ان کی یاد میں لکھی ہے جس کا عنوان ہے: "الافراق":

جا بیا مغرب میں آفر اے مکاں تیر کیاں آہ مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمین
پوری نظم بانگ در اصفہ ۴۴ پر ملاحظہ فرمائیے۔

ان کی آفری تصنیف ISLAMIC FAITH ہے جو ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی تھی اس کتابچے میں انہوں نے اپنے شاگرد (اقبال) کی خدمت میں بھی خراج تحسین ادا کیا ہے۔

راستہ میں دہلی میں قیام کیا اور حضرت محبوب الہیؒ کے مزار پر کمال حسن عقیدت کے ساتھ حاضر ہوئے
اور کامیابی کے لیے دعا کی۔ یہ دعا ایک نظم کی صورت میں آج بھی باصرہ نوازی اور بصیرت افروزی کی سلمان
اپنے اندر رکھتی ہے اور بانگ درا کے صفحہ ۹۰ پر مندرج ہے۔ پہلے بند میں توصیف ہے اس کے بعد انچاہ
حلی ہے لے کے وطن کے نگار غائبے شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
پھر آکھوں قدم مادہ و پدہر پہ جبین کیا جنہوں نے محبت کا راز داں مجھ کو
فی الجہل تام نظم جذبات عالیہ سے معمور ہے ناظرین کتاب میں ملاحظہ فرمائیں اس نظم میں یہ شعر بھی تھا۔
مجلد ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا ملا ہے جن کے کرم سے یہ آتاں مجھ کو
مگر مطبوعہ نظم میں یہ شعر درج نہیں ہے۔

DR. MCTAGGART ۱۸۶۵ء/۱۹۲۳ء کمبرج میں فلسفہ کا پروفیسر تھا اس کے فلسفیانہ نظام
کا اصطلاحی نام ONTOLOGICAL IDEALISM ہے۔ اس کی فکر کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ چونکہ
خودی (EGO) قائم بالذات اور ازلی ہے اس لیے خدا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جین دھرم کا
بنیادی عقیدہ یہی ہے۔

DR. E. BROWN "تاریخ ادبیات ایران چہار جلد کے شہرہ آفاق مؤلف فارسی اور عربی کے
یہ نظیر محقق، نہایت شریف اور نیک نفس انسان، جس نے صدائے نوجوانوں کو سکا لرا اور ڈاکٹر اور نقاد بنادیا
کمبرج یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ کثیر النثر اور وجود فارسی مخطوطات اُن کے کتب خانہ میں
موجود ہیں۔ بابائی اور بہائی مذہب کے متعلق ان کی معلومات لائق رشک تھیں۔

DR. R.A. NICHOLSON کمبرج یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں۔ بقیہ حیات میں یہ مؤلف تاریخ
ادبیات عرب، شمع تصوف سے غاص رہے کئی کتابیں اس موضوع پر تالیف کی ہیں۔ زاویہ نگاہ
نگاہ اور غیر مجددانہ ہے۔ اسرار خودی کا ترجمہ 'SECRETS OF THE SELF' کے نام سے شائع

کر کے مسلمانوں پر احسان عظیم کیا ہے۔

۷ (DR. SORLEY) کیمرج یونیورسٹی میں فلسفہ اخلاق کے پروفیسر ہیں۔ عمر غالباً ۶۷ سال ہوگی۔ ان کی مشہور تصنیف MORAL VALUES AND THE IDEA OF GOD ہے۔ ۱۹۳۶ء میں انہوں نے ڈاکٹر اقبال کو کیمرج مدعو کیا تھا۔

۸ ۱۹۳۵ء میں میور وڈوالی کو بھی میں منتقل ہو گئے تھے۔

۹ ۱۹۲۶ء میں آپ اپنے عقیدہ مندوں کے اصرار سے پنجاب کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے آمادہ ہوئے عموماً امیدوار ہزارا دوسپہ فرج کرتے ہیں اور ادنیٰ سے ادنیٰ دوڑ کی خوشامد و غلیظہ حیات بن جاتی ہے لیکن اہل لاہور جانتے ہیں کہ اقبال بغیر منت مملوک کا میاب ہوتا تھا۔

کونسل میں آپ نے برابرتین سال تک ملک اور قوم کی گراں بہا خدمات انجام دیں جن کی تفصیل کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں آپ کو انجمن اسلامیہ مدراس نے اسلام پر لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا۔ چنانچہ آپ نے چھ لیکچر دیئے جس ۱۹۲۹ء میں ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوئے۔ وہاں سے آپ میسور منگلور جوتے ہوئے حیدر آباد دکن آئے۔ یہاں کی علمی مجلسوں کو نوازا۔ اور طالبان علم کی پیاس بجھائی۔

دسمبر ۱۹۳۰ء میں سرکار برطانیہ نے گول میز کانفرنس میں نمائندہ مقرر کر کے لندن بھیجا۔ (۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو محمد علی کا انتقال ہوا)

اکتوبر ۱۹۳۲ء میں تیسری کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے۔

۱۰ ماہ دسمبر ۱۹۳۲ء میں لندن میں ARISTOTELIAN SOCIETY کے سالانہ جلسہ میں ایک

معرکہ الاراء مضمون پر تباحث کا عنوان ہے۔ "IS RELIGION POSSIBLE"

اس سفر میں آپ نے اسپین کا بھی دورہ کیا اور عربوں کی عظمت رفتہ کے آثار غرناطہ اور قرطبہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ فردی یا مارچ ۱۹۳۳ء میں واپس آئے۔

(واضح ہو کہ یہ مضمون ۱۹۳۳ء میں لکھا تھا اس لیے یہیں ختم ہو گیا۔)

پہلی ملاقات جنوری ۱۹۲۵ء میں ہوئی تھی۔

۱۱ یہ ۱۹۳۳ء کی بات ہے اب ۱۹۶۹ء میں میری راتے بدل چکی ہے۔

۱۲ اس مثنوی سے شاعری مضمون نہیں ہے۔ مذہبی بت پرستی یا بت گری مقصود ہے۔

۱۳ چونکہ عالم کی حیات زود بخودی پر موقوف ہے اس لیے زندگی بقدر استواری ہے۔

- ۱۴ جب قطرہ خودی کا سبق حفظ یاد کر لیتا ہے تو اپنی بے قیمت ہمتی کو موتی میں تبدیل کر لیتا ہے۔
- ۱۵ زندگی تو جستجو میں پوشیدہ ہے اور اس کی اصل آرزو میں پوشیدہ ہے۔
- ۱۶ دل سوز آرزو سے زندگی حاصل کرتا ہے اور جب وہ زندگی حاصل کرتا ہے تو غیر حقیقی فنا ہو جاتا ہے۔
- ۱۷ زندہ انسان کو تنہا کی نفی مردہ کر دیتی ہے جس طرح اگر شعلے میں سوز کم ہو جائے تو وہ آخر کار فناء ہو جاتا ہے۔
- ۱۸ علم کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کی مخالفت کا سامان مہیا کرے اور خودی کی تقویم (پابنداری) کے سبب غم نہ کئے
- ۱۹ خودی محبت سے پائندہ تر، زندہ تر، سوزندہ تر اور تابندہ تر ہو جاتی ہے۔
- ۲۰ عشق کو تیغ و خنجر کا خوف نہیں ہوتا کیونکہ اس کی اصل آدھی نہیں ہے۔
- ۲۱ عشق کی بدولت نجد کی خاک چالاک ہو گئی۔ وعدہ میں آئی اور آسمان کے اوپر چلی گئی۔
- ۲۲ مصطفیٰ کا مقام مسلمان کے دل میں ہے اور ہماری آبرو مصطفیٰ ہی کے نام سے ہے۔
- ۲۳ جنہوں نے دشمنوں پر رحمت کا دروازہ کھولا اور کئے کو لا شرب (آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہو گا) کا پیغام دیا۔
- ۲۴ انہوں نے نسب کے امتیازات کو بالکل فنا کر دیا ان کی تعلیم نے اس خس و خاشاک کو بھسم کر دیا۔
- ۲۵ گلی صدر برگ کی طرح جاری خوشبو بھی ایک ہی ہے۔ وہی اس نظام کی جان ہیں اور وہ ایک ہیں۔
- ۲۶ کیا تو عشق رسولؐ کا مدعی ہے؟ اگر ہے تو پھر محبوب کی تقلید کر کے گم ہو جاتا۔ تاکہ تیری کندیز داں کو شکار (گرفتار) کر سکے۔
- ۲۷ تاکہ خدا نے کعبہ تجھ پر نوازش فرمائے اور تجھے الٰہی جاعلؑ کی شرح بنا دے یعنی خلیفۃ اللہ فی الارض کے مقام پر فائز فرما دے۔
- ۲۸ حضرت عیسیٰؑ کی طرح اونٹ سے خود نیچے اتر۔ غیر کا احسان اٹھانے سے سوار اللہ کی پناہ۔
- ۲۹ اپنا رزق دوسرے کے دسترخوان سے مت ڈھونڈ۔ آفتاب کے چہرے سے پانی کی موج مت مائے۔
- ۳۰ تاکہ تو پیغمبر کے سامنے اُس دن شرمندہ نہ ہو جو بہت روضہ فرما ہو گا اس لیے اللہ سے بہت طلب کر اور دنیا کا مقابلہ کر۔ دست سوال دراز کر کے ملت بیضا کی آبرو زائل مت کر۔
- ۳۱ اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ بن جاتا ہے اور چاند اس کی انگلی کے اشارے سے پھٹ جاتا ہے۔
- ۳۲ وہ خصوصیات جہاں میں حکم (چرخ) بن جاتا ہے اور شاہانِ عالم اس کے تابع فرمان ہو جاتے ہیں۔
- ۳۳ بے نیستی سے صدامراض پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً کو تھام دستی، بے دلی اور دول ہمتی۔
- ۳۴ چو کہ وہ (افلاطون) ذوقِ عمل سے محروم تھا اور اس کی جان وارفتہ معدوم ہوتی اس لیے وہ موجودہ

ہنگامے دکاتنا خدا جی کا شکر ہو گیا اور اعیان نامشہود کا خالق بن گیا۔

۳۷ بہت سی قومیں اس کی شراب سے سوسم ہو گئیں اور گیتیں اور اس لیے ذوقِ عمل سے محروم ہو گئیں
۳۸ لے وہ شخص کرتیری تھیلی میں شاعری کی نقدی ہے۔ اس شاعری کو زندگی کی کسوٹی پر پرکھ (کہ یہ
شاعری سچی ہے یا کھوٹی)

۳۹ فکر و شن میں غل ملگن رہنا ہوتی ہے جس طرح بجلی کی چمک کر کلک سے پہلے ہوتی ہے (اور اس کی
طرف رہنا ہوتی ہے)

۴۰ تجھے لازم ہے کہ ادب میں فخرِ صانع سے کام لے اور اس کے لیے تجھے عربی شاعری کی طرف
مراجعت کرنی پڑے گی۔

۴۱ اے غفلت شعار! اطاعتِ الہی کی کوشش کر۔ اختیار، جبر، اطاعت) سے پیدا ہو سکتا ہے۔

۴۲ ہر شے کا ہاں قانون ہی سے قوی ہوتا ہے تو اس سامان سے کیوں غافل ہے؟

۴۳ آئین کی شدت کا شکوہ مت کر اور شریعت کی حدود سے باہر مت نکل۔

۴۴ جو شخص خود اپنے نفس پر حکمران نہیں ہے وہ ضرور دوسرے کا محکوم بن جاتا ہے۔

۴۵ جب ہم لالہ کا حصا تیرے ہاتھ میں ہے تو خوف کے ہر ظلم کو باطل کرتا رہے گا۔

۴۶ جو شخص سبھی اقلیم لائیں آباد ہو گیا وہ عورت اور اولاد دونوں کی قید سے آزاد ہو گیا۔

۴۷ وہ ماسوائے اللہ سے قطع نظر کر لیتا ہے (اور) اپنے بیٹے کے گلے پر چھری رکھ دیتا ہے۔

۴۸ نامہِ حق تو عالم کی روح کی مانند ہوتا ہے اس کی ہستی (در اہل) اسمِ عظم کا ظل ہوتی ہے۔

۴۹ وہ جزوِ اور کل (انسان اور خدا) کے درمیان سے آگاہ ہوتا ہے اور اللہ کے حکم سے اس جہاں میں قائم ہوتا ہے۔

۵۰ وہ نوبِ انسانی کے لیے بشرِ فانی ہوتا ہے وہ سپاہی بھی ہوتا ہے سپر گھڑی بھی ہوتا ہے اور امیر

(سپہ سالار) بھی ہوتا ہے۔

۵۱ وہ علمِ الاسما کا مدعا اور مقصد ہوتا ہے اور سبحان الذی امر علی کا مجید ہوتا ہے۔

۵۲ اس کی ذات، ذاتِ عالم کی تشریح ہوتی ہے اور اس کے جلال سے عالم کی نجات والبتہ ہوتی ہے۔

۵۳ اے تہذیبِ کین کے امانت دار! اپنے اجداد کے مسلک سے منحرف نہ ہو۔

۵۴ مسلمان کی طبیعتِ محبت کی بدولت قاهر ہے اور مسلمان اگر عاشق نہیں ہے تو کافر ہے۔

۵۵ اس کا دیکھنا اور نہ دیکھنا تابعِ احکامِ حق ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کا کھانا پینا اور سونا بھی۔

۵۶ اپنے ہر عمل سے قربِ حق مقصود رکھ تاکہ تیری ذات سے اس کا جلال آشکار ہو۔

۵۷ جوشن غیر اللہ کی خاطر تلوار کھینچتا ہے (جنگ کرتا ہے) اور اصل وہ اپنی تلوار اپنے ہی سینے میں پرت کرتا ہے۔

۵۸ زندگی تو دوسروں کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کا نام ہے اور اپنے آپ کو بیت الاحرم (کعبہ) سمجھنے کا نام ہے۔

۵۹ مسلمان کا علم سوز دل سے کامل ہوتا ہے کیونکہ اسلام کے معنی ہیں آفل کو ترک کر دینا۔

۶۰ دانش حاضر سے سوزِ عشق تمت طلب کرو۔ حق کی کیفیت اس کافر کے جام سے مت مانگو۔

۶۱ دانش حاضر تو حجاب اکبر ہے۔ بیت فروش، ثمت پرست اور بیت تراش ہے۔

۶۲ جو اللہ تعالیٰ کے جمال کا عاشق ہے وہی تمام کائنات کا سرور ہے۔

۶۳ میں کیا بتاؤں کہ اس شیر کار از کیا ہے؟ اس کی آبِ زندگی سے اپنا سراپا (اپنا وجود) حاصل کرتی ہے۔

۶۴ حیدر کا تہ جو کہ خیر گیر تھا اس کی قوت اسی تلوار سے تھی۔

۶۵ تو کہ زمان کی اصل سے آگاہ نہیں ہے (اسی لیے) حیاتِ جاوداں سے آگاہ نہیں ہے۔

۶۶ زندگی دہر (زمان) سے ہے اور دہر زندگی سے ہے۔ اسی لیے نبی کافران یہ ہے کلا تَسْبُوا اللہ ہتر یعنی دہر کو بُرا مت کہو۔

۶۷ ساز و قتِ نغمہ خاموش رکھتا ہے اور اگر تو زمان کے راز سے آگاہ ہونا چاہتا ہے تو اپنے دل میں غوطہ لگا۔

۶۸ عشق کو شعلِ لا سے آگاہ کر اور لا اللہ کے دھڑ سے آشنا کر۔

۶۹ میں تو تیرے لطف و کرم سے ایک ہمد کا طالب ہوں جو میری فطرت کے روض سے آگاہ ہو۔

۷۰ آگاہ میں اپنا سوز اس کے دل میں منتقل کر سکوں اور پھر اس کے دل میں اپنا چہرہ دیکھوں۔

۷۱ فردِ ملت ہی سے احترام حاصل کرتا ہے اور ملتِ افراد ہی کی بدولت منظم ہوتی ہے۔

۷۲ جس شخص نے ملت کے زرم سے پانی نہ پیا تو اس کے نفات کے شعلے اس کے عود (زمان) میں فسرہ (مرہ) ہو کر رہ جاتیں گے۔

۷۳ انسان کی فطرت آزاد بھی ہے اور مقید بھی ہے اور اس کے جزو میں گل کو گرفت میں لانے کی قوت پوشیدہ ہے۔

۷۴ جماعت سے والہ تر وہ کہ خودی خود ٹکس بن جاتی ہے لیکن اس کا ثمرہ یہ مٹا ہے کہ وہ خودی پھول کی پتی سے ترقی کر کہہ چن ہو جاتی ہے۔

۷۵ ستاروں کی محفلِ جذبِ باہمی پر موقوف ہے اور ایک ستارے کی ہستی دوسرے ستارے کی بدولت تکمیل پر

نبی کہتا ہے کہ تو کسی انسان کا بندہ نہیں ہے اور ان بتان بے زباں سے کتر نہیں ہے۔

تاکہ انہیں ایک اور صرف ایک مقصد پر متحد کر سکے وہ (نبی) ان کے پاؤں میں قانون کی ٹیریاں ڈال دیتا ہے۔

انہیں توحید کا تختہ از سر نو سکھاتا ہے۔ نیز تسلیم و رضا کا قانون سکھاتا ہے۔

خوف اور شک و دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور اہل کی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی آنکھ کائنات

کی مخفی طاقتوں کو دیکھ سکتی ہے۔

جب عہدہ کا مقام محکم ہو جاتا ہے تو (مسلمان کا) بھیجک مانگنے کا پیالہ جام جمشید بن جاتا ہے۔

قلب بیضا بنزرتوں ہے اور کلہ توحید اس کے حق میں بنزرتوں روح ہے۔ یہ توحید ہی ہمارے سباز

ہستی کے پردوں کو گردش دیتی ہے۔

کلہ توحید ہی ہمارے تمام اسرار حیات کا سرمایہ ہے اور اس کا دھاگا ہی ہمارے تمام انکار کا شیرازہ ہے۔

بنت کا وجود دلوں کی یک رنگی پر قوت ہے اور یہ کوہ سینا (قلب) ایک ہی جلوے سے نور ہے۔

قوم کے افراد کے داغوں میں ایک ہی تصور ہونا چاہیے اور ان کے دلوں میں ایک ہی مقصود ہونا چاہیے۔

نسب پر ناز کرنا نادانی ہے کیونکہ اس کا حکم صرف جسم پر نافذ ہے اور جسم فانی ہے۔

ہماری قلب کی بنیاد کچھ اور ہی ہے اور یہ بنیاد ہمارے دلوں میں پوشیدہ ہے۔

ہم حضور کی تعلیم کی برکت سے بھائی بھائی بن گئے ہیں اور ایک زبان، ایک دل اور ایک جان ہو گئے ہیں۔

اے مسلمان کہ تو غم کے زندان میں قید ہے اپنے نبیؐ سے لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا کی تعلیم سیکھ۔

ایمان کی قوت تیری حیات کو بڑھا سکتی ہے اس لیے تجھے (اخوف علیہم) کا ورد کرنا چاہیے۔

غیر اللہ کا خوف، عمل کا دشمن ہے اور زندگی کے قافلے کا رہزن ہے۔

تیرے قلب میں جو بھی برائی پوشیدہ ہے اگر تو غور کرے تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ اس کی

بنیاد غیر اللہ کا خوف ہے۔

جس نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی روح کو سمجھ لیا ہے اس پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ شرک

در اصل خوف میں پوشیدہ ہے یعنی جو غیر اللہ سے ڈرتا ہے وہ دراصل شرک ہے۔

اللہ سے ڈرنا ہی ایمان کا عنوان ہے اور کچھ نہیں۔ غیر اللہ کا خوف (غیر اللہ سے ڈرنا) ہی شرک

پہناں ہے اور کچھ نہیں۔

نبی مسلمان کے قلب و جگر کی قوت بن جاتا ہے اور خدا سے بھی زیادہ محبوب ہو جاتا ہے۔

ہم نے دین فطرت نبیؐ سے سیکھا اور اس طرح راہ حق میں ایک شمع روشن کر دی۔

- ۹۶ حضور کا یہ ارشاد کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، دراصل خدا کا احسان ہے جو اس نے بندوں پر کیا ہے اور یہ عقیدہ پردہ ناموسی مصطفیٰ ہے۔
- ۹۷ مسلمان کے دل میں یہ عقیدہ راسخ ہے کہ سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں اور صریحاً کا عقیدہ اس کی ہستی کا سرمایہ ہے۔
- ۹۸ مسلمان امتیازات کو برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ مساوات کا عقیدہ اس کی بنیاد (مرثیہ) میں سگایا ہے وہ حق کے لیے خاک اور خون میں لوٹا۔ اس طرح وہ اللہ کی بنیاد بن گیا۔
- ۹۹ مسلمان ماسوی اللہ کا غلام نہیں ہو سکتا اور اس کا سر کسی فرعون کے آگے نہیں جھک سکتا۔
- ۱۰۰ ہم نے قرآن کی رمز حین سے سیکھی اس کی آگ سے بہت سے شعلے جمع کیے۔
- ۱۰۱ تو مسلم ہے اس لیے اپنا دل کسی خاص اقلیم سے مت لگا اور اس جہان چون وچند میں گم مت ہوجا۔
- ۱۰۲ دل کی دولت حاصل کر لیں کہ یہ جہان آب و گل دل کی وسعت میں گم ہوجاتا ہے۔
- ۱۰۳ ہجرت مسلمان کی زندگی کا قانون ہے یہ مسلمان کے ثبات کے اسباب میں سے ہے۔
- ۱۰۴ مچھلی کی طرح سمندر میں آباد ہوجا یعنی قید مکان سے آزاد ہوجا۔
- ۱۰۵ جو شخص قید مکان سے آزاد ہو گیا وہ آسمان کی طرح کائنات میں آباد ہو گیا۔
- ۱۰۶ جس سیاست نے مذہب کی مندر پر قبضہ کر لیا تو مغرب کے گلشن میں یہ شجر پروان چڑھا۔
- ۱۰۷ نتیجہ یہ نکلا کہ جسم سے روح نکل گئی صرف جسم باقی رہ گیا آدمیت تو گم ہو گئی صرف اقوام باقی رہ گئیں۔
- ۱۰۸ مسلمان قوم خدا کی نشانیوں میں سے ہے اور اس کی اصل "قائلا ابلی" کے ہنگامے سے ہے۔
- ۱۰۹ یہ قوم موت سے بے پروا ہے اور "نحن نزلنا" سے استوار ہے۔
- ۱۱۰ چونکہ خدا نے "أَنْ يَطْلُقَهُ" فرمادیا ہے اس لیے یہ چراغ کبھو جانے سے محفوظ ہو گیا ہے۔
- ۱۱۱ مسلمان کی ہستی صرف آئین پر موقوف ہے۔ نبی کے دین کا باطن صرف یہی ہے اور کچھ نہیں۔
- ۱۱۲ قرآن حکیم زندہ کتاب ہے اور اس کی حکمت لازوال اور قدیم ہے۔
- ۱۱۳ اس کے الفاظ مشک اور تفسیر سے پاک ہیں اور اس کی آیات تاویل سے بے نیاز ہیں۔
- ۱۱۴ یہ کتاب نوری انسان کے لیے پیام آخری ہے اور رحمت للعالمین اس کے حامل ہیں۔
- ۱۱۵ اسے مسلمان تو رسوم میں گرفتار ہو چکا ہے اور کفر کے طریقے تیرے حق میں رنجان بن گئے ہیں۔
- ۱۱۶ تو نے زبر میں اپنے امر کو قطع کر دیا اور تو الی شئی و نحو کے صحرا میں جادہ پیما ہو گیا۔
- ۱۱۷ اگر تو مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتا ہے تو یقین نہیں جب تک کہ تو صرف قرآن کو اپنا رہنما نہیں بنائے گا۔

۱۱۹ اگر تقلید کرنا کوئی نیک طریقہ ہوتا تو پیغمبر بھی اپنے باپ دادا کے مذہب کی تقلید کرتے۔
 ۱۲۰ اپنے بزرگوں کی راہ پر چل کیونکہ جمعیت اسی صورت سے حاصل ہوگی۔ تقلید کا مطلب ہے ملت کے قانون کا اتباع۔

۱۲۱ توحید کا مطلب اپنے دل پر نقش کر لے اور تقلید سے اپنے طرز عمل کو درست کر لے۔

۱۲۲ انخطاؤں کے زمانے میں اجتہاد کرنا گویا قوم کی لہاٹ کو لپیٹ دینا ہے۔

۱۲۳ عالمان کم نظر کے اجتہاد سے اسلاف کی پیروی کرنا بہتر ہے۔

۱۲۴ مسلمان ایک آئینی سے زندہ ہے اور ملت کا جسم قرآن کی بدولت زندہ ہے۔

۱۲۵ ہم سب خاک ہیں صرف قرآن دل آگاہ ہے اسے منسوبی سے تمام لے کیونکہ وہ اللہ کی رسی ہے۔

۱۲۶ کیا تو جانتا ہے کہ اس فرمان کا راز کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ خطروں میں زندگی بسر کرنا ہی حقیقی زندگی ہے۔

۱۲۷ دین مصطفیٰ دین حیات ہے اور اس کی شریعت آئین حیات کی تفسیر ہے۔

۱۲۸ جب سے مسلمانوں نے شعار مصطفیٰ ترک کر دیا اس وقت سے قوم بزرگوار سے محروم ہو گئی۔

۱۲۹ ایک مرید سے کہا کہ اے جان پدر تجھے خیالات عجم سے بچنا لازم ہے۔

۱۳۰ (کیونکہ اگرچہ اس کی نگو آسانوں سے بھی آؤچی ہو گئی لیکن دین نبی کی حدود سے متجاوز ہو گئی۔

۱۳۱ اپنے دل کو صرف حق (قرآن) سے مضبوط کر عرب سے ہوا فتنہ پیدا کر تا کہ تو مسلمان ہو سکے۔

۱۳۲ اپنی زندگی کا رشتہ ختم الرسل سے مت توڑ۔ نیز اپنے فن اور اپنے قدم پر بھروسہ ماست کر۔

۱۳۳ اے مسلمان تو مصطفیٰ کی شاخ کا ایک غنچہ ہے اس لیے مصطفیٰ کی بادبہاری سے بھول بن جا۔

۱۳۴ تجھے اُسی کی بہار سے رنگ و بو حاصل کرنی چاہیے اور اُسی کے شعلے سے کچھ حصہ حاصل کرنا چاہیے۔

۱۳۵ جس کی انگلی کے اشارے سے چاند و مہر ٹوٹے ہو گیا اس کی رحمت عام ہے اور اس کے

اخلاق عظیم ہیں۔

۱۳۶ اگر تو اُس کے تمام سے دُور ہے تو پھر ہماری جماعت میں سے نہیں ہے۔

۱۳۷ امتوں کی پیدائش کا قانون یہی ہے کہ زندگی کسی مرکز پر مجتمع ہوتی ہے۔

۱۳۸ قوم میں ربط اور نظام مرکز ہی سے پیدا ہوتا ہے اور مرکز ہی سے اس کی زندگی میں دوام پیدا ہوتا ہے۔

۱۳۹ بیت الاحرام (مکہ) ہمارا راز دار بھی ہے اور راز بھی ہے اور بیت الاحرام ہمارے لیے سوز بھی

ہے اور ساز بھی ہے۔

۱۴۰ اسی نے ہم کو دنیا میں مشہور کیا اور اسی نے ہمارے حدوث سے قدم (ازلیت) کو وابستہ کر دیا۔

- ۱۴۱ معاہدہ زندگی کے بقا کا راز ہے اور زندگی کی سیب صفت قوتوں کو ایک نقطہ پر جمع کر سکتا ہے۔
- ۱۴۲ جب زندگی کسی مقصد سے آشنا ہو جاتی ہے تو اس عالم کے اسباب کی ضابطہ ہو جاتی ہے۔
- ۱۴۳ مقصود عمل میں مثل روح پوشیدہ ہوتا ہے اور عمل اُسی سے اپنی کیفیت اور کثیت حاصل کرتا ہے۔
- ۱۴۴ چونکہ تیری ہستی کا راز بحجیر (اعلاء کلمۃ اللہ) میں پوشیدہ ہے اس لیے لا الہ الا اللہ کی حفاظت اور اشاعت تیرا فرض منصبی ہے۔
- ۱۴۵ جب تک ساری دنیا میں حق کی اشاعت نہ ہو جائے۔ اگر تو مسلمان ہے تو ایک لمحے کے لیے بھی آرام مت کرنا۔
- ۱۴۶ ماسوا (کائنات) تسخیر کے لیے ہے اور کچھ نہیں ہے۔ اس کا سینہ تیرے تیروں کا نشانہ ہے اور کچھ نہیں ہے۔
- ۱۴۷ اگر تو غنچہ ہے تو اپنی ذاتی سعی سے چرین تعمیر کر اور اگر تو شبنم ہے تو آفتاب کو سحر کر لے۔
- ۱۴۸ اٹھ اور اپنی محمور سلکھیں کھول اور اس عالم مجبور کو بے قیمت اور بے کار مت سمجھ۔
- ۱۴۹ اس کا مقصد مسلمان کی ذات کی توسیع ہے اور مسلمان کی ذاتی قوتوں کا امتحان لینا ہے۔
- ۱۵۰ اللہ تعالیٰ اس جہاں کو نیچو کاروں کے حصّے میں دے دیا ہے اور اس کا جلوہ مومن کی آنکھ کے حوالے کر دیا ہے۔
- ۱۵۱ تو کہ خطابِ انظر کا مقصود ہے (اللہ نے انسان کو محکم دیا ہے کہ اونٹ کی تخلیق پر غور کرے) اس راستے (حیات دینی) کو اندھوں کی طرح کیوں طے کر رہا ہے؟ کائنات میں غور کیوں نہیں کرتا؟ علم اسماہی سے آدم کی اولاد کی عزت ہے اور حکمتِ اشیا سے آگاہی کی بنا پر ہی وہ اپنی حفاظت کر سکتا۔
- ۱۵۲ رابطہ ایام ہمارے لیے بمنزلہ پیرین ہے اور حفظِ روایات کہن اس کے لیے بمنزلہ سوتی ہے۔
- ۱۵۳ اسے کہ تو اپنے سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ بتا تو سہی کہ تاریخ ہے کیا؟ کیا یہ کوئی داستانِ یاقصہ یا افسانہ ہے؟
- ۱۵۴ نہیں بلکہ یہ تجھے تجھ سے آگاہ کرتی ہے۔ تجھے آشنائے کار اور مردِ راہ بناتی ہے۔
- ۱۵۵ اگر تو حیاتِ لازوال چاہتا ہے تو اپنے ماضی کا رشتہ حال و مستقبل سے مت توڑ۔
- ۱۵۶ وہ جس کے وجود پر کائنات ناز کرتی ہے اُس نے عورت کا ذکر غنچہ اور ناز کے ساتھ کیا ہے۔
- ۱۵۷ جس مسلمان نے عورت کو کینز سمجھا وہ قرآنی حکمت سے کوئی حصّہ حاصل نہ کر سکا۔
- ۱۵۸ اگر تو غور سے دیکھے تو اہمیت ایک رحمت ہے کیونکہ اس کو نبوت سے ایک نسبت حاصل ہے۔

عورت کی شفقت پیغمبر کی شفقت سے مشابہ ہے اور اقوام کی سیرت کی تشکیل کرتی ہے۔

اُس مقصود و حرفِ مکن نکالنے فرمایا ہے کہ جنت تو ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔

ملت کا وجود ماؤں کی تعظیم پر موقوف ہے ورنہ کارِ زندگی خام ہے۔

ماتیں رمزِ اخوت کی محافظ ہوتی ہیں۔ اور قرآن اور ملت کے حق میں ان کا وجود باعثِ تقویت ہوتا ہے۔

بتولِ تسلیم کی کھیتی کا حاصل ہے اور ماؤں کے لیے اسوۂ کامل ہے۔

وہ صبر و رضا کی ادب پر درودہ بچی پستی رہتی تھی اور قرآن کی تلاوت کرتی رہتی تھی۔

ہمارا بچہ جب تیرا دودھ پینا چھوڑ دیتا ہے تو سب سے پہلے تو ہی اسے لا الہ الا اللہ کہنا سکھاتی ہے۔

تیری ہی محبت ہمارے انوار کی تشکیل کرتی ہے اور ہماری گفتار، فکر اور کردار کی تشکیل کرتی ہے۔

دورِ حاضر بہت عیار اور رکاوٹ ہے اس کا کارواں تقدیرین کے لیے بمنزلہ رہزن ہے۔

اس کا ادراک اندھا اور خدا شناس (خدا کا مشکر) ہے اور کم عقل افراد اس کے بچاک میں گرفتار ہیں۔

اے مسلمان خاتون! دنیا کے ہنگاموں سے ہوشیار رہ اور اپنے بیٹوں کو اپنی آغوش میں محفوظ کر لے۔

ایک ہو جا اور ایک سے موافقت پیدا کر۔ دوتی سے تعلق قطع کر لے۔ اپنی وحدت کو پارہ پارہ مت کر۔

ایک ہو جا اور توحید کو دیکھ لے اور اس کے غائب کو اپنے عمل سے موجود کر لے۔

عمل میں ایمان کی لذت بڑھ جاتی ہے۔ وہ ایمان مردہ ہے جو عمل میں منتقل نہیں ہوتا۔

بندہ سچی بندۂ اسباب نہیں ہوتا۔ زندگانی رہٹ کی گردش نہیں ہے۔

تو (جو کلمہ) مسلمان ہے اس لیے غیر اللہ سے بے نیاز ہو جا اور اہل عالم کے حق میں سراپا خیر و برکت بن جا۔

چونکہ راہ بہت دشوار ہے اس لیے کم سے کم سامان اپنے ساتھ رکھ۔ اس دنیا میں آزاد ہو کر زندہ رہ اور

آزادی کی حالت میں رخصت ہو۔

کیا دوس کے سنت پر لات مار دے، سرِ گردن، گٹا دے مگر عزتِ نفس کو ہاتھ سے مت دے۔

بے نیازی کیا ہے؟ خدا کی صفت اپنے اندر پیدا کرنا اور غیر کے رنگ کو اپنی شخصیت سے مٹانا۔

تو دراصل آفتاب ہے۔ کبھی اپنے اندر تو جھانک۔ دوسروں کے ستاروں سے چمک دیکھ حاصل ہو کہ

تو کب تک محض کے چراغ کا طواف کرتا رہے گا؟ اگر تیرے سینے میں دل ہے تو اپنی آگ میں جل

باپ، ماں اور چچاؤں (نسبی تعلقات) سے فارغ ہو جا اور مسلمان کی طرح اسلام کا فرزند بن جا۔

اگر تو نسب کو مروتِ ملت بنالے گا تو اخوت کے نظام میں رخنہ پڑ جائے گا۔

- ۱۸۲ ہم نے تو محبوبِ حجازی سے عشق کر لیا ہے اسی لیے ہم آپس میں مربوط ہو گئے ہیں۔
- ۱۸۳ صرف اس سے محبت ہمارے باہمی تعلق کے لیے کافی ہے اور ہماری آنکھوں کے لیے صرف اس کی شراب کی کیفیت کافی ہے۔
- ۱۸۵ عشق جان میں ہوتا ہے جبکہ نسب جسم میں ہوتا ہے اور عشق کا رشتہ نسب سے محکم تر ہوتا ہے۔
- ۱۸۶ جو شخص بھی باپ دادا کی قید میں ہے وہ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُفَلَدْ کے نکتے سے ناواقف ہے۔
- ۱۸۷ ہمارا رشتہ "لم یکن" سے قوی ہو سکتا ہے اور اس صورت میں ہم اقوامِ عالم میں بے مثال ہو سکتے ہیں۔
- ۱۸۸ چونکہ خدا کی ذات واحد اور لامشریک ہے۔ اس لیے اس کا بندہ بھی کسی شریک سے رفاقت نہیں کر سکتا۔
- ۱۸۹ اس کے جسم پر لا تَحْزَنْ لَہٗ کَافِرٌ ہوتا ہے اور اَنْتُمْ الْاَعْلَوْنَ کا تاج اس کے سر پر ہوتا ہے۔
- ۱۹۰ بندہ مومن باطل کے سامنے ہنزلہ تلوار اور حق کے سامنے ہنزلہ سپر ہوتا ہے اور اس کا امر و نہی غیر و شر کے لیے ہنزلہ معیار ہوتا ہے۔
- ۱۹۱ تو قرآن کو ترک کر کے دنیا میں ذلیل و خوار ہو گیا۔ اور اپنی کوتاہ فہمی کی بنا پر گردشِ دوزل کا شکار ہو کر نکلے
- ۱۹۲ اسے بنیم کی طرح زمین پر گرے والے مسلمان! آگاہ ہو کہ قرآن تیری نفل میں ہے جو زندہ کتاب ہے۔
- ۱۹۳ میں نے شاعری کی شمع سے مصلح آراستہ کی اور قوم کو حیات کا راز بتایا۔
- ۱۹۴ اگر میرا دل آئینہ بے جہر (سیاہ) ہے اور اگر میرے کلام میں کوئی تعلیمِ غیرِ قرآنی ہے۔
- ۱۹۵ تو میری نحو کے ناموس کا پردہ چاک کر دیجئے اور ملت کے خیاباں کو میرے کانٹوں سے پاک کر دیجئے۔
- ۱۹۶ نیز قیامت کے دن مجھے خوار اور رسوا کر دیجئے اور اپنے پاؤں کے برے سے محروم کر دیجئے۔
- ۱۹۷ بارگاہِ ایزدی میں عرض کیجئے یعنی میرے لیے دعا کیجئے کہ میرا عشقِ عمل سے ہم آہنگ ہو جائے۔
- ۱۹۸ چونکہ میری زندگی اعمالِ صالحہ سے خالی ہے اس لیے مجھے یہ آرزو زیب تو نہیں دیتی (مگر)
- ۱۹۹ آپ کی شانِ رحمت تو گیتی نواز ہے (اس لیے) آرزو کرتا ہوں کہ میں حجاز میں وفات پاؤں۔
- ۲۰۰ اگر میرے جسم کے اجزاء آپ کے دروازے سے دوبارہ زندہ ہو کر اکٹھے تو اگرچہ میری موجودگی قابلِ افسوس ہے مگر آئندہ زندگی قابلِ تحسین ہو جائے گی۔
- ۲۰۱ میرے ستارے (مقدّر) کو دیدہ بیدار عطا فرما۔ اور اپنی دیوار کے سامنے میں دو گز زمین عطا فرما۔



اقبال اور قرآن

سینڈیر نیازی

انجمن خدام القرآن کے سوس جناب ڈاکٹر اسرار احمد کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں پر قرآن مجید کے کچھ حقوق ہیں۔ ایک اسے ماننا، دوسرا پڑھنا، تیسرا سمجھنا، چوتھا عمل کرنا، پانچواں دوسروں تک پہنچانا، پھر ان پانچوں حقوق کو بعنوانات ذیل یوں ترتیب دیا ہے تاکہ ہم سمجھ لیں کہ یہ حقوق فی الواقع ہیں کیا اور باعتبار ان کے ہم پر کیا فرائض عاید ہوتے ہیں۔ عنوانات یہ ہیں:

- ۱۔ ایمان اور تعظیم
- ۲۔ تلاوت اور تزیل
- ۳۔ تذکر اور تذکر
- ۴۔ حکم اور قاست
- ۵۔ تبلیغ اور تبیین

ایمان اور تعظیم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کو صدق دل سے مانیں۔ ہر حالت میں اس کے ادب اور احترام کا خیال رکھیں۔ نہ کوئی ہستی اللہ تعالیٰ سے زیادہ واجب التعظیم ہے نہ اس کے کلام سے بڑھ کر کوئی اور کلام واجب التعظیم و محترم۔

تلاوت و تزیل سے مراد ہے قرآن مجید کو جملہ آداب ظاہری و باطنی اور لوازم تجوید کے ساتھ خوش دلی اور خوش الحانی سے رک رک کر اور مہذبہ ٹھہر کر پڑھنا تاکہ اس کی تعلیمات ذہن نشین ہوتی جائیں۔ ہم خلوص نیت سے ان کے اتباع اور پیروی پر آمادہ رہیں۔

تذکر کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کا ہر ارشاد بطور ایک حقیقت ذہن میں تھم رہا ہے ہم اسے کبھی نہ بھولیں۔ ہر حالت میں اس سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کرتے رہیں۔ تذکر کے معنی ہیں غور و فکر

اور اس سے مقصود یہ کہ ہم ان حقائق کا فہم اور ادراک پیدا کریں جن کی طرف قرآن مجید نے بحالِ نصت و بلاغت جا بجا اشارہ کیا۔ بالفاظِ دیگر آیاتِ البیہ کا مطالعہ و مشاہدہ جو انفس و آفاق میں بکھری پڑی ہیں۔ جن کا تعلق جہاں انسان اور کائنات سے ہے وہاں زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں سے بھی ہے تاکہ ہم سمجھیں کہ قرآن مجید کی دعوت کیا ہے۔ ہماری غایتِ حیات کیا عالم انسانی ہو یا عالمِ فطرتِ مثبت البیہ اس میں کس طرح کا فرما ہے۔ ہم اپنی کنزِ ذات تک پہنچیں۔ یہ جان لیں اسے کائنات اور خالق کائنات سے کیا تعلق ہے۔ اس طریقِ زندگی میں جو ہمارے لیے تجویز ہوا کیا مصلحت ہے۔ یہ بنیادی سوالات ہیں جن پر انسان ہمیشہ سے غور کرتا چلا آیا اور غور کرتا رہے گا۔ لہذا قرآن مجید میں تدبر اور تفکر بھی ایک ایسا عمل ہے جس کی کوئی انتہا ہے نہ اختتام۔

حکم اور اقامت ہے قرآن مجید کے احکام کی منصفانہ پابندی اور ان سب فرائض کی پیروی اس طرح عائد ہوتے ہیں ہر حالت میں بجا آوری۔ اقامتِ جتد و جہد ہے جو اس نظامِ اجتماع یا معاشرہ کے قیام و استحکام میں لازم ٹھہرتی ہے جو قرآن مجید کا مقصود ہے اور جس کی ابتداء نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصولاً اور عملاً ہر پہلو اور ہر جہت سے واضح اور مکمل طور پر کر دی۔ تبلیغ عبارت ہے تعلیماتِ قرآنی کی ہر گیر اشاعت سے کہ ان سے دنیا کا کوئی انسان اور کوئی قوم بے خبر نہ رہے اور تبیین یعنی جیسا بھی موقع اور جیسے بھی حالات کا تقاضا ہے آیاتِ قرآنی کی توضیح و تشریح۔

آئیے اب ڈاکٹر صاحب کے ان ارشادات کے پیشِ نظر یہ دیکھیں کہ اقبال نے ان حقوق کو کس طرح اور کہاں تک پورا کیا۔

سب سے پہلا فریضہ ایمان اور تعظیم ہے اور اسی سے ایک مسلمان کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اقبال نے قرآن مجید کو دیے ہی مانا جیسے ہر سچے مسلمان کا فرض ہے وہ صدقِ دل سے اس پر ایمان لائے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے لفظاً اور معنیٰ حضور رسالت مآب پر نازل ہوا اور بعینہٗ آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کی تعلیمات عالمگیر ہیں۔ دوامی اور ابدی، جن میں سرِ نمونگیِ میشی کی گنجائش نہیں۔ تعظیم کا یہ عالم تھا کہ جہاں قرآن مجید کا ذکر آیا ان کا سرفرطِ ادب سے جھک گیا۔ چہرہ متغیر ہو گیا۔ لہجہ ان کے "لَوْ اَنْزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ"

عَلَى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا لِّمَتَّصِدَةٍ عَاقٍ خَشْيَةَ اللَّهِ“ قرآن مجید کی عظمت کا احساس بڑھتا جاتا۔ کسی گہری فکرمیں ڈوب جاتے اس عالم میں ان کی دلی کیفیت کا اندازہ انہیں کے اس شعر سے کیجئے جس میں گویا اسی ارشاد باری تعالیٰ لَوَاتَزْنَا هَذَا الْقُرْآنَ... کی ترجمانی نہایت خوبی سے ہوئی ہے۔

آنحضرتؐ کوہ بارش برنافت سطوت اور زہرہ گردوں شگافت

تلاوت کا فریضہ تو اس وقت تک جاری رہا جب تک علالت نے انہیں بے بس نہیں کر دیا۔ ان کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے ہوا اور قرآن مجید ہی پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ بچپن ہی سے نماز فجر کے بعد علی الصبح قرآن مجید کی تلاوت کرتے۔ برادب بیٹھ جلتے۔ خوش الحان تھے۔ ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت پر غور کرتے ٹھہر ٹھہر کر آگے بڑھتے تاکہ ہر لفظ اور ہر آیت کے معنی ذہن نشین ہو جائیں۔ قرآن مجید کی تلاوت اور مطالعہ ہی ان کا محبوب ترین اور دل و دماغ کا سرمایہ تھا۔ ان کی غذائے رُوح ان کے لیے سرور و استہاج کا لازوال سرچشمہ۔ علالت کے ہاتھوں دم کشی اور بس صوت کے باعث جب تلاوت سے معذور ہو گئے تو فوس فرمایا۔

لطیف قرآنِ سحر باقی نماند

قرآن مجید سے ان کی شیفنگی اور وہابانہ شغف کا یہ عالم تھا کہ کوئی بھی مصروفیت ہو، کیسا بھی انہماک، گھر بار کے معاملات، دنیا کے دھندے ان کا دل ہمیشہ قرآن مجید میں رہتا۔ دوران مطالعہ ہی اکثر ذہن طاری ہو جاتی۔ باوازل بند تلاوت کر رہے ہیں تو آواز گونگ رہے آنکھیں پُرم۔

تذکر کے لیے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ کوئی گنگو ہو، تحریر یا تقریر جہاں کوئی بات کہنے کی ہوتی ان کا ذہن بے اختیار ارشاداتِ قرآنی کی طرف منتقل ہو گیا۔ جہاں کوئی حقیقت سامنے آئی، کوئی فکرمذہن میں ابھرا قرآن مجید کے حوالے سے اس کی وضاحت کر دی۔ مثالیں بہت ہیں۔ میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ ۱۹۳۷ء میں الہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے جو خطبہ ارشاد فرمایا، ارض پاک و ہند میں ایک آزاد اسلامی قومیت کی تشکیل کا اولین اعلان تھا۔ اسلامی قومیت کی تشکیل اور وہ بھی صدیوں کے زوال و انحطاط، فرقہ آرائیوں اور فرقہ بندیوں کے بعد معمولی نصب العین نہیں تھا۔ اسلامی قومیت کے احیاء اور اسلامی قومیت کے قیام میں خطرے ہی خطرے تھے۔ اندرونی اور بیرونی بھی، اس کے لیے شدید جدوجہد، بڑے صبر و استقامت، ایمانِ کامل اور

یقین محکم کی ضرورت تھی۔ یہ ایک آزمائش تھی جس میں قرآن مجید ہی سے تشک اور قرآن مجید ہی کی ثنائی سے پورے اتر سکتے تھے۔ لہذا اقبال جب سب کچھ کر چکے تو سلسلہ کلام اس ارشاد قرآنی پر ختم کیا۔
 عَلَيَّكُمْ أَهْلُكُمْ لَا يَصْرُكُوهُ مَنْ ضَلَّ إِذَا هْتَدَيْتُمْ۔ اور ظاہر ہے اس موقع پر اس سے زیادہ مناسب تنبیہ اور کیا ہو سکتی تھی کہ اگر ہمیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہونے ہم راہ ہدایت پر گامزن ہیں تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ بعد ۱۹۲۷ء میں جب عالم اسلام کا سیاسی اجتماعی زوال اپنی انتہا کو پہنچ گیا جب کوئی سرزمین نہیں تھی جہاں مسلمان آزادی کا سانس لے سکے جب ان حالات میں اقبال نے خضر راہ کے عنوان سے وہ مشہور نظم جو گویا شمع و شاعر کا تہہ ہے پڑھی تو اس کا خاتمہ بھی اس ارشاد باری تعالیٰ پر ہوا۔

سلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
 ہر زمان پیش نظر لا تخلف الیعاد دار

کون مسلمان ہے جو نہیں جانتا کہ یاس کفر ہے۔ قرآن مجید نے اہل یاس کا شمار اصحاب قبور میں کیا ہے اس دور ابتلا میں جب ہر طرف مایوسی سی مایوسی چھا رہی تھی 'لا تخلف الیعاد' سے بڑھ کر امید و اعتماد کا پیغام اور کیا ہو سکتا تھا۔

رہا تہر سواس باب میں کیا عرض کیا جائے۔ محمد اقبال نے جو کچھ کہا جو کچھ سوچا جو کچھ لکھا، شعر ہو یا فلسفہ قرآن مجید ہی میں تدبر اور تفکر کی بدولت۔ اس تدبر اور تفکر کی مثالیں پیش کرنا اس کی اہمیت کو کم کرنا ہے۔ یہ تو ایک مستقل موضوع ہے۔ مختصر یہ کہ اقبال کا سرمایہ فکر قرآن مجید ہی کی تعلیمات تھیں اور کچھ نہیں تھا۔ ان کی شاعری اور افکار کا بغور مطالعہ کیجئے اس میں قرآن مجید ہی کی روح کا فرما ہے اور قرآن مجید ہی کی ترجمانی مقصود۔ اسرار و رموز اور خطابات کے علاوہ کتنی تحریریں ہیں جن کی ماہر قرآن مجید ہی میں ان کا تدبر اور تفکر ہے۔ پھر یہی تدبر اور تفکر بانگ درا سے لے کر بال جبریل۔ ضربِ کلیم: پیامِ مشرق، زبورِ عجم، پس چو باید کرد، مسافر اور ارمغانِ حجاز میں ہر کہیں نمایاں ہے بلکہ ان کی متفرق تحریریں، بیانات، تقریریں اور خطوط بھی اس سے خالی نہیں۔ گفتگوؤں میں بات ہر مہر کر قرآن مجید ہی کے معارف اور حکم پر آجاتی۔ زمانہ طالب علمی ہی میں جب انہیں قرآن مجید میں تدبر اور تفکر کا سبق دیا جا رہا تھا ان کے والد محترم بھی انہیں یہی نصیحت کرتے۔ ایک روز کہنے

لگے قرآن مجید پڑھتے تو ہوا سے سمجھتے بھی ہو۔ یاد رکھو قرآن مجید پڑھنے ہی سے نہیں دل کے راستے سے بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ اسے پڑھو تو یوں سمجھو جیسے قرآن مجید تمہارے دل پر نازل ہو رہا ہے۔

ترے ضمیر پر جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشف

اس تدبر اور تفکر اور دل کے راستے سے قرآن مجید کو سمجھنے کی داستان بڑی طویل ہے۔ اس کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ میں پھر دو ایک مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ ایک روز کہنے لگے فلسفہ ہویا مانس، از منگی اور اس کے مسائل، کوئی عقدہ ہوا مل ہوتا نظر نہ آئے تو قرآن مجید سے رجوع کرتا ہوں۔ ابنِ شاتن کا نظریہ اضافیت شائع ہوا اور اس کے ماتحت یہ ماننا لازم ٹھہرا کہ کائنات اضافہ پذیر ہے تو میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ کئی دن سوچا رہا بالآخر ایک روز اس پریشانی میں دفعۂ خیال آیا۔ کیوں نہ قرآن مجید سے رہنمائی حاصل کروں۔ میں نے علی بخش کو پکارا، علی بخش قرآن مجید لے آؤ۔ علی بخش قرآن مجید لایا اور میں نے اسے کھولا تو میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب پہلی آیت جس پر میری نگاہ پڑی یہ تھی **وَاللّٰهُ يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ** میں سمجھ گیا۔ میری شکل حل ہو گئی۔ ایسے ہی بیٹھے کا فوق البشر زیر بحث آیا تو میں نے درخواست کی کہ اس باب میں دانستہ یا نادانستہ جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں یا کر دی گئیں ان کا ازالہ ضروری ہے۔ ناقدین نے فوق البشر کا سلسلہ خواہ مخواہ ناپ حق سے جوڑ رکھا ہے۔ فرمایا میں تو ان کا کب سے ازالہ کر چکا۔ میں نے جو کچھ کہا ہے میرے ناقدین اسے غور سے کیوں نہیں پڑھتے۔ میں نے عرض کیا میں انہیں کے خیال سے کچھ ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ان غلط فہمیوں کے پیش نظر چند ایک باتوں کی ایک حد تک وضاحت ہو جائے اور وہ بھی آپ کی طرف سے تو اچھا ہو گا۔ فرمایا اگر تمہارا ایسا ہی خیال ہے تو کل سر پہر کا وقت مناسب رہے گا۔ ذرا جلدی چلے آنا۔ دوسرے روز حاضر خدمت ہوا اور کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا تو فرمایا یہ سامنے کی الماری میں قرآن مجید رکھا ہے۔ قرآن مجید اٹھا لاؤ۔ میں اپنے دل میں سمجھ رہا تھا کہ مجھ سے شاید فلسفہ کی بعض کتابوں کی درق گردانی کے لیے کہا جائے گا۔ میں قرآن مجید لے آیا تو ارشاد ہوا۔ سورۃ البشر کا آفری رکوع نقل کر لو۔ رکوع نقل کر چکا تو پھر چند ایک عنوانات کے ماتحت یکے بعد دیگرے مختصر کچھ شذرات لکھواتے گئے۔ یہ دن تھا جب میں پورے طور سے سمجھا کہ اقبال نے ناپِ حق کا جو تصور قائم کیا اس کی اساس

فی الحقیقت کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں تدبر و تفکر کے معنی ہی یہ ہیں کہ علم و حکمت اور فکر و فرہنگ کی ساری دنیا ہمارے سامنے ہو بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ یہ دنیا تمام و کمال ہمارے سامنے آئے گی تو قرآن مجید ہی کی بدولت۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو قرآن مجید کا رشتہ علم و حکمت سے جس طرح قائم ہے اور علم و حکمت کا قرآن مجید سے اس کا سمجھنا بہت بڑی بات ہے۔ ایک روز گفتگو تھی کہ اس عہد نے جسے سائنس کا عہد کہا جاتا ہے، مذہب کے بارے میں بڑی بدگمانیاں پیدا کر دیں بلکہ اس کے خلاف ایک معاندانہ روش اختیار کر رکھی ہے۔ فرمایا یہ اس لیے کہ لوگ علم و حکمت کی صحیح روح سے واقف ہیں نہ قرآن مجید سے کہ اس کی تعلیمات کیا ہیں۔ ارشاد ہوا اور انگریزی میں اسلام خلاصہ کائنات ہے (EPITOME OF THE UNIVERSE) اور یہی رائے ہمارے علماء کی تھی۔ مگر یہ حقیقت جب ہی مخفی ہوگی جب ہم قرآن مجید میں تدبر اور تفکر سے کام لیں۔ قرآن مجید میں تدبر اور تفکر کیجئے تو علم و حکمت ہو یا کوئی اور صداقت ہمارا رشتہ آپ ہی آپ اس سے قائم ہو جائے گا۔ یہ جو اقبال کے اشعار میں تعلیمات قرآنی کی برجستہ اور بے ساختہ ترجمانی ہوتی رہتی تھی تو اسی تدبر اور تفکر کی بدولت۔ ان کا کہنا تھا کہ قرآن مجید ہمیشہ کے لیے ہے۔ اس میں تدبر اور تفکر کا عمل بھی ہمیشہ جاری رہنا چاہیئے۔

حکم کو لیجئے تو اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ اقبال کے نزدیک انسان کے لیے کوئی اساس فکر اور اساس عمل ہے تو قرآن مجید اور صرف قرآن مجید۔ حکم کے معنی بہت وسیع ہیں۔ یہ ایک بڑی جامع اصطلاح ہے جس سے مراد ہے ان سب اوامر و نواہی کی غیر مشروط پابندی جو از روئے معروف و منکر اور حرام و حلال شریعت نے ہم پر عائد کیے اور جن کی بجا آوری سے فرد کی سیرت اور جماعت کا کردار اسلام کے سانچے میں ڈھلتا ہے جو ہماری تعلیم اور تربیت کا سرچشمہ اور اس عمارت کی اساس ہیں جسے اسلامی نظام حیات یا اسلامی طریق زندگی یا اصطلاحاً جو جی چاہے کہ لیجئے اور جو ساری نوع انسانی کو ایک اصول اور قانون پر جمع کرتے ہوئے اس راستے کی طرف لے جاتا ہے جسے اس کی فطرت کہیے جسے خالق فطرت نے خود اس کے لیے تجویز کیا۔ مختصراً یہ کہ حکم کا تقاضا ہے اقامت دین۔ بالفاظ دیگر اسلام کی ہر پہلو سے عملاً اور واقعہً ترجمانی۔ لہذا اس معاشرے کی تعمیر جو وحدت بشری کی تمہید ہے اور جس کے لیے ایک آزاد اور با اقتدار، مخصوص و متمیز اور جد گانہ سیاسی

اجتماعی گروہ بندی ناگزیر پھرتی ہے جس کے بغیر ناممکن ہے فرد یا جماعت کی زندگی اسلام کے معیار پر پوری اترے۔ یہی وہ جدوجہد ہے جس میں چراغِ مصطفوی سے شرارِ بوالہبی کی ستینہ کاری میں ہمارے ایمان اور صبر و استقامت کا امتحان ہوتا ہے اور جس کا، جب ارضِ پاک و ہند کی سیاست ایک فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ گئی، وقت آیا اور اقبال نے قوم کو یاد دلایا کہ ہم نہ بھولیں بحیثیت قوم ہمارا فریضہ کیا ہے، ہماری حیاتِ اجتماع اور قومی شخص کا راز کیا۔ لہذا اس مرحلے میں ہمارا موقف کیا ہونا چاہیے تو ان کی مخالفت میں غیروں کی طرف سے جو آواز اٹھی اس میں ایک حد تک اپنوں نے بھی حصہ لیا۔ حالانکہ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر اسلام محض ایک عقیدہ نہیں کہ ہم نے اسے مانا اور اپنی ذاتی اور نجی زندگی سے باہر اس پر عمل سے کنارہ کش ہو گئے بلکہ ایک دستورِ حیات جس کے افہام و تفہیم کے لیے انبیاءِ علیہم السلام تشریف لاتے جو حضورِ رحۃ للعالمین کی بعثت کے ساتھ بطور ایک دینِ کامل افرادِ اقوام کی زندگی لہذا امورِ انسانی میں ہمیشہ کار فرما تھا آج بھی ہے اور رہے گا اگر اس دستورِ حیات کی ترجمانی ایک نظامِ ہدایت کی شکل میں نہیں ہوتی۔ اگر اس کی بنا پر ایک ایسی قوم وجود میں نہیں آتی جس کا ضمیرِ فالحسّانی اور نقطہ نظرِ انسانی، جغرافیائی، انسانی، طبیعتوں سے بالاتر محض انسانیت پر مرکوز ہے تو کوئی بھی جدوجہد ہو سیاسی یا اجتماعی دہنی یا اخلاقی اس سے کیا حاصل، یہ ایک سیدھی سادی سی بات تھی جس میں کوئی انجی پیج نہیں تھا مگر جسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی حالانکہ اس کا مطلب بھڑاس کے کچھ نہیں تھا کہ اگر اسلام ایک عالمگیر دعوت ہے، اگر اس کا خطاب ساری دنیا، انسانی اقوام اور اُمم سے اور عالمِ تاریخ سے ہے لہذا کسی ایسے نصب العین پر جس سے بحیثیت ایک نوع ہماری تقدیر اور مستقبل وابستہ ہے اور یہی فی الحقیقت تہذیب و تمدن کی اساس۔ اگر مسلمانوں کا کوئی اجتماع کروار سے کوئی فریضہ ہے جو عالمِ بشری کی ہدایت اور خیر و سعادت کے لیے ان پر عائد ہوتا ہے۔ اگر یہی ہماری زندگی کا مقصد ہے تو ہم اسے آزادی و اقتدار ایک قوم کی حیثیت ہی سے جیسا کہ زبانِ سیاست میں اس کا مفہوم ہے اور جس کے لیے تخیلات کی تشکیل ہونی ادا کر سکتے ہیں۔ نہ اسلامی قومیت کسی دوسری قومیت میں ضم ہو سکتی ہے نہ اس کے دستورِ حیات میں کسی دوسرے دستورِ حیات کا پیوند لگ سکتا ہے۔ ہمارا فرض ہے ہم اپنا ملی شخص قائم رکھیں۔ پھر جب اس ملی شخص کے شعور ہی سے ہماری تعلیم و تربیت میں کچھ معنی پیدا ہوتے اور ہمارا قومی وجود قائم ہے تو حقِ باطل

میں شرکت کے کیا معنی۔

باطل دُونی پسند ہے حق لا شریک ہے

شرکت میاۓ حق و باطل نہ کر مت قبول

یہ فرض ہے جس کی انہوں نے عمر بھر تلقین کی جس کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دی شعر ہو یا فلسفہ ادب اور فن یا سیاسی اور ملی زندگی کا کوئی گوشہ وہ جہاں کہیں بھی اور جس حال میں تھے، اسی نصب العین پر قائم رہے اور یہی اول و آخر ان کی آرزو رہی کہ اُمت اپنے اصل الاصول پر آجائے عصر حاضر کا انسان اپنی سعی و محنت، اپنی عقل و فکر کی تازگی اور علم و ہنر کی نادرہ کاری سے جو دنیا پیدا کر رہا ہے زندگی نے جو انقلاب انگیز کروٹ لی ہے، ارباب نظر جس نئے اور تابناک مستقبل کا جو خواب دیکھ رہے ہیں مسلمان اس سے غافل نہ رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک موقع دیا ہے اسی میں ان کا امتحان ہے۔ وہ اٹھیں، اپنے ایمان و یقین کی تجدید کریں اور اس دنیا کی تعمیر میں مصروف ہو جائیں جو اسلام کا مقصود ہے۔ لہذا جیسے جیسے دن گزرتے گئے ان کی گفتگو کا کوئی موضوع تھا تو یہی اور یہی ہر ایک سے ان کا کہنا حتیٰ کہ علالت کے آخری ایام میں جب ان کے لیے سانس لینا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ انہیں کوئی خیال تھا تو یہی کوئی پریشانی تھی تو یہی۔ چنانچہ انہیں کا ایمان و یقین بصیرت اور فراست تھی کہ ارض پاک و ہند کی بساط سیاست دیکھتے دیکھتے بدل گئی۔ کچھ چلنے راہ گروں کر دیکھ مرنے خود آگاہ ہے

مسلمانوں نے جان لیا ان کے مستقبل کا راز کیا ہے ان کے لیے صحیح راہ عمل کیا۔

بات طویل ہو رہی ہے کہنا یہ ہے کہ اقبال کا کوئی پیغام تھا تو یہی کہ مسلمان سمجھ لیں ان کی زندگی قرآن مجید سے ہے۔ قرآن مجید میں فکر و نظر سے کام لیں۔ اس کی تعلیمات پر عمل کریں۔ قرآن مجید ہی ان کا ایک سرمایہ ہے یہی ان کا پیغام تھا جسے انہوں نے طرح طرح سے پیش کیا۔ شعریں، فکر میں تحریر و تقریر میں، گفتگوؤں میں، اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کوئی معاملہ ہو، کوئی مسئلہ، علم و حکمت کی بحث ہو، تہذیب و تمدن یا ادب اور فن، سیاست اور معاش، فرد کی زندگی، جماعت کے مفاد، انسان، اس کے ضمیر اور باطن، احوال و واردات، امور عالم کی غرضیکہ کوئی موضوع ہو بلا آخر قرآن مجید ہی پر ختم ہوتا۔ قرآن مجید ہی نے ان کے فکر کو جلادیا۔ قرآن مجید نے ہی ان کی شاعری

میں وہ کیفیت وہ درد و سوز اور ذوق و شوق پیدا کیا جس کا سرشتہ ایمان میں نے عرض کیا تھا۔ ان کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے ہوا ادا اگر ہم نے اقبال کو سمجھ لیا ہے تو جیسا کہ ہر کوئی سمجھ سکتا ہے اس تعلیم کا خاتمہ بھی قرآن مجید ہی پر ہوا۔ آخری عمر میں بھی ان کی کوئی خواہش تھی تو یہی کہ قرآن مجید کے معارف اور حکم پر قلم اٹھائیں۔ زندگی کے آخری لمحے آئے تو یہی آرزو کہ قرآن مجید میں اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ جب زندگی ہو یا آخرت اس کا رشتہ قرآن مجید ہی سے وابستہ ہے انہوں نے کہا ہے اور خوب کہا۔

گر تو می خواہی مسلمان زلیتن

نیت ممکن جز بقراں زلیتن

لیکن اس "بقراں زلیتن" کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس جدوجہد میں جو نوع انسانی کو ازل سے درپیش ہے جس میں تاریخ کی حیثیت ایک لمحے کی ہے جس میں اقوام و اُمم یکے بعد دیگرے ایلے اُبھرتی ہیں جیسے کسی بہتی ہوئی ندی میں پانی کے جیلے جس میں تہذیب و تمدن نے کئی رنگ بدلے چشم فلک نے کئی انقلاب دیکھے اور جس کا سلسلہ اس لیے جاری ہے اور جاری رہے گا کہ انسان اپنے مدعا و منتہا کو پالے، ہم اس جدوجہد میں مردانہ وار جھڑپیں۔ اسے اسلام کے قالب میں ڈھالیں یہ مقصد و عظمیٰ نصیحت اور تحریر و تقریر سے حاصل نہیں ہوگا۔ قرآن مجید پر عمل کرنے سے

اے کہ می نازی بقراں عظیم تا کجا در حصرہ با باشی مقیم
در جہاں اسرار دیں را فاش کن محنت شریع میں را فاش کن

یہ اس لیے کہ زندگی کو ثبات ہے۔ اس کی تقویم کا کوئی نسخہ، اس کے امکانات کے حصول کا کوئی راستہ، اس کی غایت اور کنہ میں اور اک کا کوئی ذریعہ ہم سمجھ لیں اس کا رُخ فی الحقیقت کس طرف ہے تو قرآن مجید ہی کی بدولت۔ یہی ہماری تعمیر ذات اور یہی ایک ایسی زندہ و پائندہ شخصیت کی اساس ہے جسے موت کا ہاتھ بھی فنا نہیں کر سکتا، قرآن مجید ہی اس حکم اور ترقی پذیر نظام تمدن کا صورت گر ہے جس کی ساری نوع انسانی کو ضرورت ہے۔ وہ ایک عالمگیر اور ابدی پیام ہدایت ہے جو ہمارے لیے مژدہ حیات لے کر آیا جس میں ہمارا ہی ذکر ہے جسے یاد رکھنے کے لیے آسان کر دیا۔
وَلَقَدْ كَسَبْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَكِّرٍ يَوْمَئِذٍ صَادِقٌ ہے عین علم و حکمت، مترا
دستور و قانون، سراسر موعظت اور رحمت!

اِس کتابِ زندہ فِترانِ حکیم حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخہٴ اسرارِ تنکوینِ حیات بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
صرفِ او راریب نے تبدیل نے آیہٴ اششِ شرمندہٴ تاویل نے
نوعِ انساں را پیامِ آخرین حاملِ او رحمۃً للعالمین!

اب اگر ہمیں زندگی کی نعمت ملی ہے، ہمارے نزدیک اس کے کچھ معنی ہیں، ہم اس کی تَبَّابِ محسوس کرتے، اس کے ذوق و شوق اور سوز و ساز کے لذتِ آشنائیں، ہمارے سینوں میں بھی ہی آرزوئیں اور تمنائیں پرورش پا رہی ہیں، وہی عزائم اور مقاصد ابھر رہے ہیں جن کا تعلق جہاں داری اور جہاں بانی سے ہے، عالمِ محسوس کی تسخیر اور ایک برتر تہذیب و تمدن کے نشو و نما سے، ایک ایسی دنیا کا تصور ہیں جو عمل پر اُکسار رہا ہے جس میں انسانیت کا جوہر کھلے، جس میں زندگی کو اس کے سارے جمال و جلالت کے ساتھ عالمِ خارج میں مشہور دیکھیں جس میں نیت نئے حقائق اور نیت نئے مباحث و ذات سے لطف اندوز ہوں تو اس میں کامیابی کا رشتہ قرآن مجید ہی سے جوڑنا پڑے گا۔ پھر اس باب میں اقبال کا خطاب اگرچہ ہماری نوعِ انسانی سے تھا لیکن اس شخص سے بالخصوص جو مسلمان ہے اور اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے کہ سب سے زیادہ اسی کا فرض ہے کہ اس جد و جہد میں حصہ لے۔

چوں مسلمانان اگر داری جگر در ضمیرِ خویش و در قرآنِ نگر

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست عمر با پیچیدہ در آفاتِ اوست

یک جہانش عصرِ حاضرِ ایں است گیر اگر در سینہٴ دل معنیِ رس است

بندۂ مومن ز آیاتِ خداست ہر جہاں اندر بر او چوں قباست

چوں کہف گردو جہانے در برش می دہد قرآنِ جہانے دیگرش

فاش گویم آنچه در دل مضمر است ایں کتابِ نیتِ چہیزے دیگر است

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جان چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

ہم بھول گئے قرآن مجید ہی سے ہمارا قومی وجود قائم ہے۔ قرآن مجید ہی ہمارے ملی تشخص کا راز ہمارا آئین ہمارے لیے اصول و قوانین کا سرچشمہ۔ مگر ہم ذلیل و خوار ہو گئے۔

خوار از مہجوریِ فِترانِ شدی شکوہِ پنج گردشِ دوراں شدی

اے چوں شبہ بر زمیں افتقدہ در بغل داری کتاب زندہ
 پھر جس طرح اللہ کے کلمات ختم نہیں ہو سکتے خواہ دنیا بھر کے درخت قلم اور سمندر روشنائی بن
 جائیں، بعینہ ان کی تشریح و تفسیر تبلیغ و تمہین کا بھی کوئی اختتام ہے نہ انتہا، عقل طرح طرح سے
 ان کی طرف بڑھے گی۔ نحو ایک کے بعد دوسرا تصور قائم کرے گا۔ علم پر نئے نئے حقائق منکشف
 ہوں گے عمل سے کسی ایک عقدوں کی گرہ کھلتی رہے گی۔ لہذا ایک بات ہے جس کا اس ضمن میں
 سمجھ لینا ضروری ہے جس کی طرف اگرچہ اقبال نے اشارہ بھی کر دیا تھا مگر جس پر بہت کم توجہ کی گئی
 اور وہ یہ کہ زندگی چونکہ سراسر خلاقی اور تازہ کاری ہے اس لیے تجربے اور مشاہدے کی طرح علم
 حکمت اور فکر و وجدان کی دنیا بھی ایک تغیر پذیر دنیا ہے ساسی سے اس کی ہستی اور وجود قائم یہی
 اس کی حرکت اور یہی اس کی طلب اور جستجو کا راز۔ وہ ایک لامتناہی سفر ہے جس میں اگرچہ کوئی مرحلہ
 اور کوئی ساعت آخری نہیں لیکن جس میں ہم لازماً کسی مقام پر ہوں گے اور اسی مقام سے ماضی حال
 کا جائزہ لیتے ہوئے ایک خاص موقف قائم کرتے ہوئے ایک نئی امید اور نئے اعتماد کے ساتھ
 منظر رہیں گے کہ ہماری طلب و جستجو سے جو حقائق و اشکاف ہوئے مستقبل میں وہ کس انداز میں
 ہمارے سامنے آئیں گے۔ بعینہ جیسے ایک کوہ پیا ایک بلندی سے دوسری بلندی کی طرف بڑھتا
 ہے تو اگرچہ وہی مناظر بار بار اس کے سامنے آتے ہیں جن کو وہ اس سے پہلے دیکھ آیا تھا مگر اب
 ہر لحظہ ایک نئے رنگ میں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ عقل اور فکر کا ہے۔ کہ ہمارے وہ تصورات بھی جن
 کو ہم آخری اور قطعی سمجھتے ہیں، آخری اور قطعی نہیں ہوتے۔ حقیقت ایک ہے اور لامتناہی۔ جیسے
 جیسے ہم عقل اور فکر کے سہارے اس کی طرف بڑھیں گے ہمارے وہ تصورات بھی قطعی اور
 یقینی لہذا خالی از صداقت نہیں تھے، ایک نئے روپ میں ہمارے سامنے آئیں گے۔ نئے
 نئے تصورات قائم ہوتے چلے جائیں گے لیکن ایک خاص وقت میں جب حقیقت کا کوئی پہلو ابھرا
 ہوا اور اس موقف کی رعایت سے جو ایک خاص عمر میں عقل اور فکر نے قائم کیا کیونکہ بغیر اس کے
 کوئی دوسرا موقف لیکن ہی نہیں تھا تو ہم جو کچھ کہیں گے اس موقف کا لحاظ رکھتے ہوئے تاکہ اسے
 دوسروں تک پہنچا سکیں، مگر جس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوگا کہ ہم نے حقیقت کو موقف یا اس طرح
 جو تصورات قائم ہوئے ان کے تابع کر دیا۔ جس ذہنی فضا میں سانس لے رہے ہیں اس کی بڑی

تسلیم کر لی۔ حالانکہ ہم نے جو کچھ کہا محض سہولتِ افہام و تفہیم کے لیے۔ یہاں پھر ایک مثال سے کام لینا بہتر ہوگا جس سے اس امر کی مزید وضاحت ہو جائے گی کہ اقبال کے ٹھکر کی نوعیت فی الحقیقت کیا ہے۔ انہوں نے آیت نور اللہ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ کے بارے میں جب ایک مغربی مصنف کے خیال کی، جس نے اسے ایک خاص دعوے کی تائید میں پیش کیا تھا تردید کی اور کہا اس آیت کا اشارہ اس حقیقت کی طرف نہیں ہے جو مصنف کے ذہن میں ہے بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں ایک دوسری حقیقت کی طرف تو اعتراض ہو کہ اقبال نے اس آیت کی جو تاویل کی ہے صحیح نہیں۔ صحیح تاویل کچھ اور ہے جسے میں نے ان کی خدمت میں پیش کیا تو انہوں نے اپنے ایک غایت نامے میں لکھا کہ تاویل تو معترض کر رہا ہے۔ میں نے تو صرف اتنا کہا ہے کہ مصنف مذکور کے نزدیک اس آیت کا اشارہ جس حقیقت کی طرف ہے صحیح نہیں۔ میں تاویل کا قائل نہیں ہوں میرا مذہب اس معاملے میں وہی ہے جو ان حزم کا اور جسے مولانا روم نے اپنے اس ارشاد میں کس خوبی سے ادا کر دیا ہے۔

کردہ تاویل صرف بحرِ را خلیش را تاویل کن نے ذکر کرنا
یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اس حرفِ بحر کے معنوں کی از روئے فکر و تحقیق فلسفہ کی نفی
نہیں ہوتی۔ نہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اپنے خیالات کے جوازیں کوئی عقلی حیلہ تراش رہے ہیں مگر
بات پھر طول کھینچتی رہی ہے۔ مجھے چاہیے سلسلہ کلام ختم کر دوں۔ بیان ہے ان حقوق کا جو قرآن مجید
کی طرف مسلمانوں پر عاید ہوتے اور اقبال کے قرآن مجید میں ایمان و یقین کا ع
سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

بہتر ہو گائیں آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہ آپ نے میری معروضات کو
سے سنیں، سلسلہ کلام اقبال ہی کے اس قطعہ پر ختم کر دوں۔

بہ قرآن پیش خود آئینہ آویز دگرگوں گشتہ از خلیش بگریز
ترازوئے بنہ کردار خود را قیامت ہستے پیشین را براہگیر

(ماخوذ از 'مباحث' جنوری فروری ۱۹۷۷ء)